

# میرے آنے کا انتظار رہا

رسا چغتائی

شاخ بدن سے لگتا ہے  
مٹی راجستھانی ہے

صرف مانع تھی حیا بندِ قبا کھانے تلک  
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

تیرے آنے کا انتظار رہا

رسا چغتائی



جملہ حقوق محفوظ

کتاب تیرے آنے کا انتظار رہا  
مصنف رسا چغتائی  
سرورق انعام راجا  
تیسرا ایڈیشن 2007ء  
مطبع ذکی پرنٹرز، کراچی  
قیمت 300 روپے

زیر اہتمام

آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی

## دل دادگانِ غزل کے لیے



شہر کراچی میں شعر و ادب، علم و فن کی ترویج، ثقافتی نشوونما، تخلیق کاروں اور فن کاروں کے لیے  
ستون اور سائے کے مانند ایک مرکز قائم کرنے کی غرض سے 1956ء میں  
آرٹس کونسل آف پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔

آج اس کا شمار پاکستان کے معتبر ترین تہذیبی اداروں میں ہوتا ہے۔  
گزشتہ سال ہم نے کراچی کے ادیبوں اور شاعروں کی شعری اور نثری تخلیقات شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔  
ہمیں فخر ہے کہ اس سال ہم اپنے شہر کے تین مستند فن کاروں کے مجموعوں  
کی اشاعت کی صورت میں اپنے وعدے کا ایفا کر رہے ہیں۔  
تینوں مجموعے عرصے سے دست یاب نہیں تھے۔  
یقیناً ان کی اشاعت دیگر تشنگانِ سخن کی سیرابی کا موجب ہوگی۔  
جناب رسا چغتائی کا شعری مجموعہ ترے آنے کا انتظار رہا اسی عزم کی ایک کڑی ہے۔  
انشاء اللہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

انیق احمد

سیکرٹری دارکان مجلس عاملہ

## دریچہ

- 15- جھٹ پٹا سا خیال کا ہوتا
- 18- پہ روشن اک دریچہ کیا ہوا
- 21- آنا یا رہائی کا
- 23- رات آنکھوں میں ہو بس کیوں کر
- 25- سامنے جی سنبھال کر رکھنا
- 26- ہے لیکن اجنبی ایسا نہیں ہے
- 28- تیرے آنے کا انتظار رہا
- 29- کوئی طوفان اس نظر میں تھا
- 31- رہنا ہر دم بجھا بجھا سا کچھ
- 32- ترے نزدیک آ کر سوچتا ہوں
- 34- یاد آتا ترے عجیب تو نہ تھا
- 35- جب بھی تیری یادوں کا سلسلہ سا چلتا ہے
- 36- میں نے سوچا تھا اس اجنبی شہر میں زندگی چلتے پھرتے گزر جائے گی

- 37- تشنگانِ عشق لبِ تشنہ طے
- 38- کوئی تعمیر کی صورت نکالو
- 39- بے اثر ہے اثرِ نالہ و فریاد بھی
- 40- شام سے پہلے گھر گئے ہوتے
- 41- رات درکار تھا سنبھالا مجھے
- 43- یاد تو ہوگا تجھے عشق وہ پہلا پہلا
- 44- آنکھ سے پھراک آنسو پکا اور پھراک جگ بیت گیا
- 45- ناب ہم سا کوئی پیاسا طے گا
- 48- عرصہ وحشت میں تاحہ نظر کوئی نہیں
- 49- یونہی چلتے رہیں گے قافلے کیا
- 50- بستی بستی مگر نگر دیکھا
- 52- درختوں کے نہیں دامن تلے کیا
- 54- زندگی شعلہ فشاں گزری ہے
- 55- افلاس کی تہمت سے گزر کیوں نہیں جاتے
- 56- ساتھ کسی کا ہم کیا دیتے
- 57- اُس کو تشریفِ داستاں میں تھی
- 59- جانے کیا سوچ رہا تھا میں بھی
- 60- یہ ہنگامہ پیا کس کے لیے ہے
- 62- رات بھر جھللا کے ڈوب گئے
- 63- آتی ہے شام کس گھر سے
- 65- جب تک دور جام چلے گا
- 67- خواب اس کے ہیں جو چڑا لے جائے
- 69- دل نے اپنی زباں کا پاس کیا
- 70- ہوئیں آنکھیں عجب بے حال اب کے
- 71- ہے وفا شرطِ محبت تو تقاضا کیسا
- 72- یوں گنوا تا ہے کوئی جان عزیز
- 74- کہاں جاتے ہیں آگے شہر جاں سے
- 75- نکل کر سایہِ ابر رواں سے
- 76- چاندنی رات اور لبِ دریا

- 79۔ موسم کیسا گیانی ہے
- 81۔ کیا گماں کیا خبر
- 83۔ سناٹا دو پہر سے
- 84۔ کوئی دل کی زباں سمجھتا ہے
- 85۔ سر پہ انسانیت کا تاج بھی ہے
- 86۔ زمیں کا بوجھ ہے اس سر پہ آسماں کی طرح
- 87۔ آدمی سمجھتا ہے زندگی کی قیمت کیا
- 88۔ ضروری ہے خیال رفتگاں بھی
- 89۔ یہ بولچھ دکھائی دیتا ہے
- 91۔ دریا کھل بھی آئے گا
- 95۔ ہاتھ تراکس شانے پر ہے
- 97۔ منی جب تک نم رہتی ہے
- 98۔ ہوا کس کا تعاقب کر رہی ہے
- 101۔ دیدنی اک جہان ہے، پر کیا
- 103۔ یوں اسے طبع بدگماں دیکھیں
- 104۔ میں نہ تھا اور وہ گھر آیا تھا
- 105۔ ایک آنسو ایک لمحہ ایک خواب
- 106۔ باغ آجڑے ہوئے زمانہ ہوا
- 109۔ نہ طاق شب نہ چراغ سحر کو دیکھتے ہیں
- 110۔ شہر دل کی سربراہی اور ہے
- 112۔ کہیں انسان بے چہرہ کھڑا ہے
- 114۔ چلمن ڈالے شب کیسی
- 115۔ رُخ گھٹا کا ہے سمندر کی طرف
- 117۔ نکس ہے یا تابانی ہے
- 121۔ دیکھ مجھے میں فردا ہوں
- 124۔ تیغ ادا کھینچی ہوئی تسمہ پاکسے ہوئے
- 125۔ نہ دل انگیز تیرا غم ہی ایسا
- 126۔ شام کے سائے ہیں مائل کس طرف
- 129۔ رات ہم نے جہاں بسر کی ہے



- 130 - ہاتھ میں ٹھنڈا آسکتا ہے
- 132 - نام جو بھی ہو نسب جو بھی ہو
- 133 - عمر گزری رو گز کے آس پاس
- 135 - یہ شہر بے اماں سے
- 136 - بے طور جاں گنوا دی خود آپ ہم نے ورنہ
- 137 - تیر جیسے کمان کے آگے
- 138 - عارضوں کو ترے کنول کہنا
- 139 - کس طرف کوچ کر گئے پیارے
- 140 - عمر گزری روتے لیکن ایسا سنا نا تھا
- 141 - اے خداوند ذوالجلال مجھے
- 143 - اپنی بے چہرگی میں پتھر تھا
- 144 - میں نے پوچھی نہ اس نظر نے کہی
- 145 - کچھ نہ کچھ سوچتے رہا کیجیے
- 146 - کوئی درد آشنا نہیں نہ سہی
- 147 - روز آ کر گلے سے لگتے ہیں
- 149 - میر جی سے اگر ارادت ہے
- 152 - رہتے جسم و جاں بھی ہوتا ہے
- 154 - میرا اک چھوٹا سا گھر ہے
- 155 - سامنے گھر ابھی نہیں آیا
- 156 - میں جس دل میں کیوں ہوں گھر ہے میرا
- 157 - جسم بدلے گا جان بدلے گا
- 159 - رات ہے یا بوا مکانوں میں
- 160 - وہ بھی سب کی نظر میں آئے گا
- 162 - محبت خبط ہے یا وسوسہ ہے
- 164 - ایک راہ خیال پر تنہا
- 166 - خاک اڑتی ہے اس جہان میں کیا
- 169 - ٹوٹ کر پیار کیوں نہیں کرتا
- 170 - کیا کوئی خواب سجائے میرے
- 171 - پوچھتے ہیں متاع درد کا مول

- 173۔ سراٹھاتا ہے چراغ دل تو جل جاتی ہے شام
- 174۔ زلف مرکز سے ہٹے
- 175۔ ملتی کیا تعبیر خواب
- 177۔ شہر کراچی یاد ہے تجھ کو تیرے شب بیداروں میں
- 178۔ جانے کیا دیدہ تر لے آئے
- 179۔ زندگی کے سراب بھی دیکھوں
- 180۔ تم کو میری یاد آئے گی، آئے گی پچھتا نا ہوگا
- 181۔ جام بولیس گے، سہو بولے گا
- 182۔ راہ جو تیرے گھر کو جاتی ہے
- 183۔ ہیں سر بستہ اگرچہ راز میرے
- 184۔ کیا لکھوں، ہے باعث تحریر کیا
- 185۔ پڑھ رہا ہوں کتاب آنکھوں میں
- 187۔ اس پہلے کہ گھر نظر آئے
- 188۔ اُس نے تقسیم کر دیا سب کچھ
- 189۔ کیسا بیجان ہے سمندر میں
- 190۔ چاند دیکھوں کہ سمندر دیکھوں
- 191۔ ہر چیز سے ماورا خدا ہے
- 192۔ اپنی یادوں کے آسمان تلے
- 193۔ تیری آہٹ رگ جاں سے آئی
- 194۔ بازی جاں بساط پر ہے یہاں
- 195۔ پاس اپنے اک جان ہے سائیں
- 196۔ پھر آج سوئے راہ بتاں دیکھتے چلو
- 197۔ شہر پیاسا دکھائی دیتا ہے
- 198۔ کچھ خانماں بر باد تو سائے میں کھڑے ہیں
- 199۔ مہکے گی کہیں زلف تو دھڑ کے گا کہیں دل
- 200۔ عکس زلف رواں نہیں جاتا
- 201۔ یاد آئے بھی تو اب وہ لب و رخسار کہاں
- 202۔ جو گھٹنا اُمنڈ کے آئی ہے وہ برس نہ لے تو یہ کیا کھلے
- 203۔ اسے دل نغمہ سرا

- 204۔ کچھ اور بیٹھتے کچھ اور جی بہل جاتا
- 205۔ رات کچھ آج شبنمی سی ہے
- 207۔ وہ جو زنداں کو گلستاں کر چلے
- 208۔ اس تکلف سے آج دل دھڑکا
- 209۔ ہم نے تو اس عشق میں یارو کھینچے ہیں آزار بہت
- 210۔ بہت دنوں سے کوئی حادثہ نہیں گزرا
- 211۔ تیشہ آہ دل شکن بھی نہیں
- 212۔ حسن بزم مثال میں کیا ہے
- 213۔ خود سے حسن خود مگر نا آشنا
- 214۔ دل کہ تھا درد آشنا تھا
- 215۔ زلف سے کاکشاں تک پہنچے
- 216۔ چھاؤں میں گیسوؤں کی مہکے تھے
- 217۔ زلف کو کھکشاں کیا ہم نے
- 218۔ ہر اک درویش کا قصہ الگ ہے
- 219۔ ممکن ہے وہ دن آئے کہ دنیا مجھے سمجھے
- 220۔ آوارہ میری طرح اگر چہ صبا بھی ہے
- 221۔ ہنگامہ ہائے گرمی بازار لے چلے
- 222۔ بند قبائے گل کی صورت کھلے ہوئے ہیں
- 223۔ گل کھلائے فصل گل اس بار کیا
- 223۔ میں اور اس موسم میں اے پروردگار
- 224۔ پیارا ایسا نہ یا ایسا ہے
- 225۔ نقش و نگار شہر دل زار دیکھنے
- 226۔ کیسے کیسے خواب دیکھے در بدر کیسے ہوئے
- 227۔ چراغ صبح سے شام وطن کی بات کرو
- 228۔ جو آتا ہے نظر ویسا ہی کیوں ہو
- 229۔ پھول ہو کہ پتھر ہوا شک ہو کہ شبنم ہو
- 230۔ الزام تراشیں تو الزام تراشیں کیا
- 231۔ اب جو دیکھا تو داستان سے دور
- 232۔ یہ جو بادیدہ تر آتا ہے

- 233۔ وہ جو کہتے ہیں بیاں ہے اُن کا
- 234۔ خواب اپنے دکھائے کس کو
- 235۔ ماں کی ہیں دعائیں ساتھ میرے
- 236۔ رندان تہی جام ہیں کچھ اور طرح کے
- 237۔ کرن پھوٹے گی پھر اس کنج لب سے
- 238۔ گل کو ہنسنے شب کہتا ہوں
- 239۔ اس ایک عالم رنگیں کا انتظار نہ پوچھ
- 241۔ کچھ تو ہے انھیں ہجر کی راتوں سے تعلق
- 242۔ دیکھتی ہے رات بستر کی طرف
- 244۔ دیے جلائے تھے ہم نے وفا کے رستے میں
- 247۔ بات بھی تول رہا ہے پیارے
- 249۔ جانتا کوئی نہیں تقدیر کیا ہے کیا نہیں
- 251۔ بے خیالی کو خیال یار باندھ
- 253۔ سر اٹھایا تو سر رہے گا کیا
- 255۔ دریا شاید زوروں پر ہے
- 257۔ تمام رشتہ عیب و ہنر سے لکھے ہیں
- 258۔ صبح سے ہے غرض نہ شام سے ہے
- 259۔ کہو اس عہدِ ناپڑساں میں جانی
- 265۔ کیا بچ تھے اُس زلفِ گرہ گیر کے اندر
- 269۔ نظمیں
- 312۔ اک شخص منحنی سا

ترکِ عشق کو کیا کہیے  
عشق اگر نادانی ہے

جھٹ پٹا سا خیال کا ہوتا  
اور دل جھوم سا رہا ہوتا

راہ چلنے میں اک لہک ہوتی  
لڑکھڑانے میں اک مزا ہوتا

کیسی جنت یہیں کہیں کوئی  
ایک ویران باغ سا ہوتا

سر پہ اک سائبان ہے وہ بھی  
آپ کہتے تو ڈھا دیا ہوتا

لہر میں ہے چراغِ دل ورنہ  
شام ہی سے بُجھا ہوا ہوتا



اس جہانِ خراب میں آباد  
ہم نہ ہوتے تو کیا خدا ہوتا  
کاش دنیا نے مرنے والے کو  
جیتے جی یہ کفن دیا ہوتا  
رات تو اک ہوا کے جھونکے نے  
مجھے پاگل ہی کر دیا ہوتا  
وہ تری یاد تھی جو لے آئی  
میں نہ جانے کہاں پڑا ہوتا  
چاند ہوتا کہیں سر کہسار  
اور میں لڑکھڑا رہا ہوتا  
عمر جیسے گزر گئی پیارے  
تو بھی ویسے گزر گیا ہوتا  
ہم اُسے حادثہ سمجھ لیتے  
وہ اگر کوئی حادثہ ہوتا

یہ گھروندا ہمارا بچپن ہے  
اک نظر دیکھ تو لیا ہوتا

آپ اپنی گزارتے صاحب  
مرنے دیتے جو مر رہا ہوتا

بے ارادہ سہی کبھی ہم سے  
بے تکلف سخن کیا ہوتا

ہم بھی رکتے اگر کوئی لمحہ  
ایک پل کے لیے رکا ہوتا

خشک پتے جلا لیے ہوتے  
کچھ اندھیرا ہی رونا ہوتا

آن اپنی جگہ مغل زادے  
عشق تو ٹوٹ کر کیا ہوتا

اب خدائے سخن تو کیا کوئی  
ثانی میرزا رسا ہوتا

دل پہ روشن اک دریچہ کیا ہوا  
بند ہم پر گھر کا دروازہ ہوا

اس طرح دیکھا تجھے کل خواب میں  
خواب پہ تعبیر کا دھوکا ہوا

تک رہا ہے آسماں کو آسماں  
جھیل کی آغوش میں سمٹا ہوا

اے ہوائے گلستاں خوش آمدید  
یاد تو آیا کوئی بھولا ہوا

جس طرف جاتا ہے دل کا راستہ  
اُس طرف بھی کیا کبھی جانا ہوا

راستے لگتے ہیں کیوں چلتے ہوئے  
کارواں لگتا ہے کیوں ٹھیرا ہوا

زندگی کتنی سبک رفتار ہے  
خود سے مل کر آج اندازہ ہوا

دیکھئے کیا وقت کی پرچھائیاں  
جوڑیے کیا آئینہ ٹوٹا ہوا

جانے والے دل سے جب جاتے نہیں  
پھر یہاں آنکھوں سے اوجھل کیا ہوا

بُن رہا ہوں جانے کن لمحوں کے خواب  
وقت کی دہلیز پر بیٹھا ہوا

ہے زمیں اوڑھے ہوئے گردوغبار  
آسماں پر چاند ہے نکلا ہوا

اس طرح بستی ہیں کوئی بستیاں  
راستے سنسان دل اُجڑا ہوا

وہ ہوائے کوئے جاناں کیا ہوئی  
وہ غبارِ راہ پیا کیا ہوا

تُو نے دیکھا ہی نہیں شامِ فراق  
خیمہٴ دل سے دُھواں اُٹھتا ہوا

اک طرف ہے طرہٴ نام و نسب  
اک طرف تقدیر کا لکھا ہوا

کوئی تو نقشِ قدم آئے نظر  
سرحدِ ادراک سے نکلا ہوا

پوچھے کس سے یہاں رہتا ہے کون  
وہ جو رہتا تھا یہاں وہ کیا ہوا

یہ بھی ممکن ہے اُدھر کوئی نہ ہو  
اور ہو بس آئینہ رکھا ہوا

آنے والے وقت کی آواز ہوں  
میں نہیں لمحہ کوئی گزرا ہوا

کر رہا ہوں آپ خود اپنا طواف  
پھر رہا ہوں گھر میں بولایا ہوا

آنا یارِ جانی کا  
کھلنا رات کی رانی کا

پہلی آندھی موسم کی  
پہلا سال جوانی کا

گرمی اُس کے ہاتھوں کی  
چشمہ ٹھنڈے پانی کا

لمبے سائے یادوں کے  
شوق ورق گردانی کا

آنا جانا رہتا ہے  
دریاؤں میں پانی کا

باہر ایک تماشا ہے  
اندر کی حیرانی کا



آخر میرا کیا ہوگا  
کیا ہوگا ویرانی کا

جاگ رہا ہے بستی میں  
جنگل قصہ خوانی کا

گردوں ایک ہیولا ہے  
نظروں کی جولانی کا

کیسا موسم آیا ہے  
خوابوں کی ارزانی کا

سرد پڑا ہے منڈی میں  
گرم لہو دہقانی کا

ساری عمر مشقت کی  
خبط کیا سلطانی کا

کام لیا میں حکمت سے  
عذر کیا نادانی کا

ڈیرہ دارن کیا جانے  
پیار کسی مغلانی کا

میرے گھر میں رہتا ہے  
دخل مری بے دھیانی کا

جل کٹیا میں بیٹھا ہے  
لیکھک امر کہانی کا

رات آنکھوں میں ہو بسر کیوں کر  
دن گزاریں ادھر ادھر کیوں کر

شام ہوتے ہی لوٹ آتے ہیں  
طائران شجر شجر کیوں کر

سانس لیتی ہے زندگی کیسے  
راہ چلتی ہے رہ گزر کیوں کر

جہر فطرت نہ ہو تو کیوں سوچے  
آدمی خوں کرے جگر کیوں کر

حرف آواز بن گئے کیسے  
حرف لکھنا ہوا ہنر کیوں کر

جنگ کیسی ہو اسے ہے اب کے  
بے سپر ہو گئے شجر کیوں کر

چل رہا ہے سفینہ ہستی  
بادبان خیال پر کیوں کر

میرے دل کو سمجھ لیا تو نے  
خانہ آباد اپنا گھر کیوں کر

خواب اپنی زمین کے لکھئے  
دامن ابرو باد پر کیوں کر

سامنے جی سنبھال کر رکھنا  
پھر وہی اپنا حال کر رکھنا

آگئے ہو تو اس خرابے میں  
اب قدم دیکھ بھال کر رکھنا

شام ہی سے برس رہی ہے رات  
رنگ اپنے سنبھال کر رکھنا

عشق کارِ پیمرانہ ہے  
جس کو پھوٹنا مثال کر رکھنا

رکشت کرنا محبتیں اور پھر  
خود اُسے پائمال کر رکھنا

روز جانا اُداس گلیوں میں  
روز خود کو نڈھال کر رکھنا

اس کو آتا ہے موج مے کی طرح  
ساغر لب اُچھال کر رکھنا  
سخت مشکل ہے آئینوں سے رسا  
واہموں کو نکال کر رکھنا

ہے لیکن اجنبی ایسا نہیں ہے  
وہ چہرہ جو ابھی دیکھا نہیں ہے  
بہر صورت ہے ہر صورت اضافی  
نظر آتا ہے جو ویسا نہیں ہے  
اسے کہتے ہیں اندوہ معانی  
لب نغمہ گل نغمہ نہیں ہے

لہو میں میرے گردش کر رہا ہے  
ابھی وہ حرف جو لکھا نہیں ہے

ہجومِ تشنگاں ہے اور دریا  
سمجھتا ہے کوئی پیاسا نہیں ہے

عجب میرا قبیلہ ہے کہ جس میں  
کوئی میرے قبیلے کا نہیں ہے

جہاں تم ہو وہاں سایہ ہے میرا  
جہاں میں ہوں وہاں سایہ نہیں ہے

سرِ دامنِ صحرا کھل رہا ہے  
مگر وہ پھول جو میرا نہیں ہے

مجھے وہ شخص زندہ کر گیا ہے  
جسے خود اپنا اندازہ نہیں ہے

محبت میں رسا کھویا ہی کیا تھا  
جو یہ کہتے کہ کچھ پایا نہیں ہے



تیرے آنے کا انتظار رہا  
عمر بھر موسمِ بہار رہا

پابہ زنجیرِ زلفِ یار رہی  
دل اسیرِ خیالِ یار رہا

ساتھ اپنے غموں کی دھوپ رہی  
ساتھ اک سروِ سایہ دار رہا

میں پریشان حال آشفۃ  
صورتِ رنگِ روزگار رہا

آئینہ آئینہ رہا پھر بھی  
لاکھ در پردہ غبار رہا

کب ہوا میں تہِ کمند آئیں  
کب نگاہوں پہ اختیار رہا

تجھ سے ملنے کو بے قرار تھا دل  
تجھ سے مل کر بھی بے قرار رہا

کوئی طوفان اس نظر میں تھا  
زور اتنا کہاں بھنور میں تھا

زندگی زہر کا پیالا تھی  
میں کسی نشہِ دگر میں تھا

سر میں سودائے عشق تھا ورنہ  
حُسن ہی حُسن رہ گزر میں تھا

ہم سے پہلے بھی عشق کا چرچا  
بستی بستی، نگر نگر میں تھا

اک ترے انتظار سے پہلے  
جس کیسا عجیب گھر میں تھا

ڈھونڈتے کیا پچھڑنے والوں کو  
 وقت اتنا کہاں سفر میں تھا  
 چند قصے کہانیوں کے سوا  
 اور کیا دامنِ شجر میں تھا  
 میں کسی خواب کے تعاقب میں  
 وہ کسی حلقہٴ اثر میں تھا  
 اہلِ دل کے لیے گنوانے کو  
 خاک اس عمرِ مختصر میں تھا  
 اب نہیں ہے تو یاد آتا ہے  
 ویسے بدنام شہر بھر میں تھا  
 کیسی ویراںگی ہے آنکھوں میں  
 کون آباد اس نگر میں تھا  
 شاخِ گل لے رہی تھی انگریزی  
 ہاتھ کس کا رسا کمر میں تھا

رہنا ہر دم بجھا بجھا سا کچھ  
ہو گیا دل کا مشغلہ سا کچھ

تیری زلفوں کا میری وحشت کا  
ملتا جلتا ہے سلسلہ سا کچھ

ہم سے ملنے کو اک زمانہ ملا  
تیرا ملنا تھا سانحہ سا کچھ

ایسا اُجڑا صنم کدہ دل کا  
ہو گیا خانہ خدا سا کچھ

دل کے صحرا میں آنکلتا ہے  
اب بھی کوئی گریز پا سا کچھ

لطف دیوانگی نہیں آیا  
بزم میں لوگ تھے شناسا کچھ

ترے نزدیک آ کر سوچتا ہوں  
میں زندہ تھا کہ اب زندہ ہوا ہوں  
جن آنکھوں سے مجھے تم دیکھتے ہو  
میں اُن آنکھوں سے دنیا دیکھتا ہوں  
خدا جانے مری گٹھڑی میں کیا ہے  
نہ جانے کیوں اٹھائے پھر رہا ہوں  
یہ کوئی اور ہے اے عکسِ دریا  
میں اپنے عکس کو پہچانتا ہوں  
نہ آدم ہے نہ آدم زاد کوئی  
کن آوازوں سے سرکلرا رہا ہوں  
مجھے اس بھیڑ میں لگتا ہے ایسا  
کہ میں خود سے بچھڑ کے رہ گیا ہوں

جسے سمجھا نہیں شاید کسی نے  
میں اپنے عہد کا وہ سانحہ ہوں  
نہ جانے کیوں یہ سانسیں چل رہی ہیں  
میں اپنی زندگی تو جی چکا ہوں  
جہاں موجِ حوادث چاہے لے جائے  
خدا ہوں میں نہ کوئی ناخدا ہوں  
جنوں کیسا کہاں کا عشق صاحب  
میں اپنے آپ ہی میں مبتلا ہوں  
نہیں کچھ دوش اس میں آسماں کا  
میں خود ہی اپنی نظروں سے گرا ہوں  
طرارے بھر رہا ہے وقت یارب  
کہ میں ہی چلتے چلتے رُک گیا ہوں  
وہ پہروں آئینہ کیوں دیکھتا ہے  
مگر یہ بات میں کیوں سوچتا ہوں



اگر یہ محفلِ بنتِ عنب ہے  
تو میں ایسا کہاں کا پارسا ہوں  
غمِ اندیشہ ہائے زندگی کیا  
تپش سے آگہی کی جل رہا ہوں  
ابھی یہ بھی کہاں جانا کہ مرزا  
میں کیا ہوں کون ہوں کیا کر رہا ہوں

یاد آنا ترا عجب تو نہ تھا  
چاند کوئی رفیقِ شب تو نہ تھا  
اس تکلف کی کیا ضرورت تھی  
منتظر تھا میں جاں بہ لب تو نہ تھا  
لوگ محفل میں اجنبی تو نہ تھے  
تذکرہ میرا بے سبب تو نہ تھا

جب بھی تیری یادوں کا سلسلہ سا چلتا ہے  
اک چراغ بجھتا ہے اک چراغ جلتا ہے

شرط غم گساری ہے ورنہ یوں تو سایہ بھی  
دُور دُور رہتا ہے ساتھ ساتھ چلتا ہے

سوچتا ہوں آخر کیوں روشنی نہیں ہوتی  
داغ بھی اُبھرتے ہیں چاند بھی نکلتا ہے

کیسے کیسے ہنگامے اُٹھ کے رہ گئے دل میں  
کچھ پتا مگر ان کا آنسوؤں سے چلتا ہے

وہ سرودِ کیف آگیاں سوزِ غم جسے کہیے  
زندگی کے نغموں میں ڈھلتے ڈھلتے ڈھلتا ہے

میں نے سوچا تھا اس اجنبی شہر میں زندگی چلتے پھرتے گزر جائے گی  
یہ مگر کیا خبر تھی تعاقب میں ہے ایک نادیدہ زنجیر ہمسائیگی

یہ درختوں کے سائے جو چپ چاپ ہیں ہم محبت زدوں کے یہ ہم راز ہیں  
اب یہیں دیکھنا رات پچھلے پہر دو دھڑکتے دلوں کی صدا آئے گی

غم کا سورج ڈھلا درد کا چاند بھی، بجھ چلے آنسوؤں کے دیے آج بھی  
اور اسی سوچ میں اب سحر آئے گی، اب سحر آئے گی، اب سحر آئے گی

لاکھ پھولوں پہ پہرے بٹھاتے رہیں لاکھ اونچی فصیلیں اٹھاتے رہیں  
جائے گی سونے گلزار جب بھی صبا اپنی آواز زنجیر پا جائے گی

روشنی شمع کی خود گلوگیر ہے، ہنسنا تہذیب ہے، جلنا تقدیر ہے  
وہ مگر قطرۂ اشکِ شبنم جسے صبح کی سب سے پہلی کرن پائے گی

تَشَنَّاں عَشَق لَب تَشَن مَلِے  
کِیے کِیے بیکراں دریا مَلِے

گل کھلیں یا زخمِ دل اب کے برس  
دیکھئے سوغاتِ موسم کیا مَلِے

کیا پتا اپنا بتائیں ہم اُسے  
یوں اگر وہ شخص ہم سایہ مَلِے

زندگی کے یہ جھیلے اور ہم  
سوچتے ہیں وہ کبھی تنہا مَلِے

شہر میں جائیں تو لوگوں کا ہجوم  
اور گھر جائیں تو سناٹا مَلِے

میں یہاں تنہا کھڑا ہوں، آپ ۛ  
کہنا گر آگے کوئی پیاسا مَلِے

کوئی تعمیر کی صورت نکالو  
کوئی تازہ بنائے عشق ڈالو

بلاقی ہیں تمہیں یادیں پرانی  
چراغِ رفتگاں فرصت نکالو

مجھے چہروں سے خوف آنے لگا ہے  
مرے کمرے سے تصویریں ہٹالو

یہ دریا ہے گزر جانا ہے اس کو  
مسافر ہو تم اپنا راستہ لو

کہاں اب وہ لباسِ وضع داری  
بہت جانو اگر غربت چھپالو

وفا قیمت نہیں جو لوٹ آئے  
تم اپنا ازسر نو جائزہ لو

نہیں آزارِ جاں کوئی تو مرزا  
کسی دیوار کا سایہ اٹھا لو



بے اثر ہے، اثرِ نالہ و فریاد ابھی  
 قسمتِ سنگ میں ہے تیشہ فرہاد ابھی  
 سلسلے درد کے جتنے بھی تھے سب ٹوٹ گئے  
 اُن سے محکم ہے مگر رشتہ بیداد ابھی  
 ہم صفیروں کی جدائی نے اُنھیں قید کیا  
 وہ اسیرانِ قفس جو ہوئے آزاد ابھی  
 اس محبت سے سرِ بزمِ ہراک سمت نہ دیکھ  
 کیا خبر، ہو کوئی لبِ تشنہ فریاد ابھی  
 زندگی ہم نے بہر طور گزاری اے دوست  
 کچھ مگر ایسے سلیقے سے کہ ہے یاد ابھی  
 قرضِ ناخن ہے کہ صدیوں سے چلا آتا ہے  
 آدمیت کہ ہے زخمِ دلِ اجداد ابھی  
 پاکی میں نہیں کاروں میں سے اترتے  
 پھرتے ہیں شہر میں بن شاہ کے اُستاد ابھی



شام سے پہلے گھر گئے ہوتے

یا سرِ شام مر گئے ہوتے

اس گدایانہ زندگی سے تو

وضع دارانہ مر گئے ہوتے

یوں بھی اک عمر رایاں گزری

یوں بھی کچھ دن گزر گئے ہوتے

تو جو دل سے اتر گیا ہوتا

زخمِ دل کے ابھر گئے ہوتے

ہم نہ ہوتے تو حادثاتِ جہاں

جانے کس کس کے سر گئے ہوتے

کوئی دامن کش خیال نہ تھا

ورنہ ہم بھی ٹھہر گئے ہوتے

شمعِ محفل نہ تھے کہ محفل میں

لے کے ہم زخمِ سر گئے ہوتے

رات درکار تھا سنبھالا مجھے  
دیکھتا ہی رہا پیالا مجھے

جانے کس شام کا ستارا ہوں  
جانے کس آنکھ نے اُجالا مجھے

میرے دل سے اُتار دے نہ کہیں  
ایک دن یہ ترا حوالہ مجھے

کس طرح میں زمیں کا رزق ہوا  
کس طرح اس زمیں نے پالا مجھے

اور کتنی ہے زندگی میری  
اور کرنا ہے کیا ازالہ مجھے

اس سے پہلے نظر نہیں آیا  
اس طرح چاند کا یہ ہالا مجھے  
آدمی کس کمال کا ہوگا  
جس نے تصویر سے نکالا مجھے  
میں تجھے آنکھ بھر کے دیکھ سکوں  
اتنا کافی ہے بس اجالا مجھے  
اس نے منظر بدل دیا یک سر  
چاہیے تھا ذرا سنبھالا مجھے  
اور کچھ یوں ہوا کہ بچوں نے  
چھینا جھپٹی میں توڑ ڈالا مجھے  
یاد ہیں آج بھی رسا وہ ہاتھ  
اور روٹی کا وہ نوالہ مجھے

یاد تو ہوگا تجھے عشق وہ پہلا پہلا  
میں اسی بزم کا اک جام ہوں چھلکا چھلکا

دور پلکوں کی منڈیوں پہ ترے شہر سے دور  
ایک آنسو کہ سلگتا رہا تنہا تنہا

ریگ صحرا سے نہ اٹھتا کوئی خورشید بھی کیا  
ہم نے کیا خاک اڑائی یونہی صحرا صحرا

بزم احساس کہ بے رنگ تھی اک مدت سے  
راگ چھیڑا تو سہی وقت نے دھیمہ دھیمہ

اب چلے ہو تو رسا جانب منزل ہی چلو  
کوچہ عشق کہ مدت سے ہے سونا سونا

آنکھ سے پھراک آنسو ٹپکا اور پھراک جگ بیت گیا  
 لیکن تیری یاد کا سایہ اب بھی گہرا گہرا ہے  
 جیون رستے ہنستے بستے پلک جھپکتے دھول ہوئے  
 شہر جہاں آباد تھا پہلے آج وہاں سناٹا ہے  
 صحرا صحرا خاک اڑاتا قیس پھرا، دیوانہ تھا  
 جس بستی میں ہم ہیں اُس کا کوچہ کوچہ صحرا ہے  
 آگ پرانی ہو یا اپنی جلنا کیا دانائی ہے  
 لیکن دل نادان ہے ایسا جانتا ہے پھر جلتا ہے  
 چوتھی سمت کو جانے والے شہزادے! اک بات سنو  
 گیسو گیسو زنجیریں ہیں پلکوں پلکوں پہرا ہے

نہ اب ہم سا کوئی پیسا ملے گا

نہ اب ایسا کوئی دریا ملے گا

نہ اب ایسی متاعِ غم ملے گی

نہ ایسا بانٹنے والا ملے گا

نہ گھبرارات تیرے دن پھریں گے

تجھے اک چاند سا بیٹا ملے گا

مرے پیروں تلے دنیا ملے گی

ردائے فقر میں مولا ملے گا

یہاں سورج ملے گا سر جھکائے

یہاں اُلٹا ہوا کاسہ ملے گا



مرے ہاتھوں کو بوسہ دینے والے  
تجھے حرفِ دمِ عیسیٰ ملے گا

پس الفاظ آئینے ملیں گے  
پس آئینہ اک چہرہ ملے گا

کبھی شہرِ وفا آنکھوں سے اوجھل  
کبھی سروِ چراغاں سا ملے گا

مری دہلیز پر ہم زاد میرا  
درپچوں میں مرا چہرہ ملے گا

یہاں کچھ پیڑ ایسے بھی ملیں گے  
جہاں آسب کا سایہ ملے گا

یہاں ہر شخص اپنی خلوتوں میں  
سرِ کوہِ انا بیٹھا ملے گا

سوائے وقت کی بے چہرگی کے  
تمہیں ان آئینوں میں کیا ملے گا

کہیں دیوار کے رشتے ملیں گے  
کہیں دیوار کا جھگڑا ملے گا

گزر جائیں گے بادل بستیوں سے  
تو دریا بستیوں سے آ ملے گا

تجھے اک دن گروہِ قاتلاں میں  
ترے ہی جسم کا سایہ ملے گا

ابھی تو دن کی زنجیریں کٹی ہیں  
ابھی تو چاند کا ہالا ملے گا

چلو اس بھیڑ ہی میں چل کے دیکھیں  
کہیں تو راہِ گم کردہ ملے گا

اُٹھو اب رات کا پچھلا پہر ہے  
چلو ایسے میں وہ تنہا ملے گا

رسا اس عشق کے جمہوریے میں  
ہر اک درویشِ شہزادہ ملے گا

عرصہ وحشت میں تاحدِ نظر کوئی نہیں  
نقشِ پا کوئی نہیں راہِ مفر کوئی نہیں

گھر جہاں ہوتا ہے ہوتی ہے وہاں ہمسائیگی  
اس بھری بستی میں یعنی میرا گھر کوئی نہیں

یا نظر آتا نہیں یا ان چراغوں کا دُھواں  
دیکھنے والا یہاں اے دیدہ ور کوئی نہیں

اب جہاں میں ہوں وہاں آرام ہی آرام ہے  
یہ بھی کوئی زندگی ہے دردِ سر کوئی نہیں

اس خرابے میں تجھے کس کا پتا درکار ہے  
ہم نہیں تو اے ہوائے رہ گزر کوئی نہیں

اب غزل کی اور کیا تعریف ہو مرزا رسا  
اس سے بہتر مصرفِ خون جگر کوئی نہیں

یونہی چلتے رہیں گے قافلے کیا  
یونہی بڑھتے رہیں گے فاصلے کیا

ابد آباد تک پھیلے ہوئے ہیں  
ہماری ہجرتوں کے سلسلے کیا

رفاقت دیکھتی ہے خانوادہ  
مسافت دیکھتی ہے آبلے کیا

زمین سے اٹھ گیا رزق محبت  
فلک سے کیجیے شکوے گلے کیا

یہ دونوں وقت جیسے مل رہے ہیں  
کبھی ہم تم گلے ایسے ملے کیا

نہ ہو جب سامنے ہم سا سخنور  
سر شاخ دہن غنچہ کھلے کیا

بستی بستی نگر نگر دیکھا

ہم ہی آئے نظر، جدھر دیکھا

اس بدن سا نہ باغچہ کوئی

اور نہ دل سا کوئی نگر دیکھا

دُور تک اُس کے نقش پا دیکھے

اور کیا تو نے رہ گزر دیکھا

کوئی آرایش گلِ نغمہ

کوئی اعجازِ نغمہ گر دیکھا

راستے میں کہیں دُھواں اُٹھتا

کوئی شعلہ کوئی شرر دیکھا



وقت جیسا نہ کوئی صورت گر  
خواب جیسا نہ دیدہ ور دیکھا

کوئی تصویر ہے نہ آئینہ  
بارہا دل میں جھانک کر دیکھا

کبھی دیکھتا نہ تھا اُس نے  
بے ارادہ سہی مگر دیکھا

زندگی کے جہاد میں ہم نے  
دھوپ دیکھی نہ دردِ سر دیکھا

وہ کوئی شام کا ستارا تھا  
یا اُسے ہم نے بام پر دیکھا

موت بھی کیا عجیب نعمت ہے  
عمر ساری گزار کر دیکھا

اس خرابے سے جانے والوں نے  
کیا نہ جانے رسا اُدھر دیکھا



درختوں کے نہیں دامن تلے کیا  
پرندوں کے ہیں جانے مسئلے کیا

نکل آتے ہیں باہر اُلجھنوں سے  
تری زلفوں کے سائے دن ڈھلے کیا

سپر انداز ہوتے جارہے ہیں  
پچھڑنے کے ہمارے حوصلے کیا

تڑپ کر جس طرح یہ دل ملا ہے  
ملا ہوگا کوئی ایسے گلے کیا

یہاں ہوتا نہیں کیا اب چراغاں  
یہاں آتے نہیں اب منچلے کیا

یہ دیوی دیوتا ان کافروں کے  
تھے ایسے ہی جیلے سانولے کیا

جنوں کیسا کہاں کا عشق صاحب  
یہ دل کیا اور دل کے ولولے کیا

مقدر ہے مرا مدفون ہونا  
تری دیوار کے سرے تلے کیا

یہیں دوزخ یہیں جنت بنے گی  
یہیں ہوں گے ہمارے فیصلے کیا

کہیں احوال کس سے اور یوں بھی  
رسا ہم کیا ہمارے مسئلے کیا

موج در موج چلے جاتے ہیں

دل ہی اپنا ہے نہ دریا اپنا

ہم ہیں منزل کہ نشان منزل

کیا ہے اس وقت سے رشتہ اپنا

زندگی شعلہ فشاں گزر رہی ہے

اور سرِ آبِ رواں گزری ہے

مسکراتی ہوئی اک شوخ کرن

میری جانب نگراں گزری ہے

کہہ رہی ہوں وہ نگاہیں جیسے

اجنبی رات کہاں گزری ہے

آخرِ شب وہ ستاروں کی پھوار

شیشہٴ دل پہ گراں گزری ہے

اک لجائی ہوئی پرچھائیں سی

بر سرِ راہ گماں گزری ہے

ہائے کس خشک زباں سے پتے

کہہ رہے ہیں کہ خزاں گزری ہے

چاندنی تھی کہ ترے جسم کی آنچ  
رات کس درجہ تپاں گزری ہے  
میں تو آزردهٔ وحشت ہوں مگر  
تم پہ کیا اہل جہاں گزری ہے  
قلبِ گردوں سے مری آہ رسا  
صورتِ کابکشاں گزری ہے

افلاس کی تہمت سے گزر کیوں نہیں جاتے  
مرنا ہے جب اک روز تو مر کیوں نہیں جاتے  
نکتے نہیں جب پاؤں زمیں پر تو فضا میں  
ذروں کی طرح لوگ بکھر کیوں نہیں جاتے  
ہم کون رسا آپ سے یہ پوچھنے والے  
جاتے ہیں جدھر لوگ ادھر کیوں نہیں جاتے

ساتھ کسی کا ہم کیا دیتے  
کب تک خود کو دھوکا دیتے

جانے دنیا کیا کیا کہتی  
جانے تم کیا طعنہ دیتے

کیا ہے رسمِ دنیا داری  
دیوانوں کو سمجھا دیتے

کام نہ بھا اُس شہر میں کوئی  
اُن گلیوں میں پہرا دیتے

آنے والے ہر لمحے کو  
اشکوں کا نذرانہ دیتے

اُن آنکھوں نے باتیں کی ہیں  
اُن آنکھوں کو بوسہ دیتے

خار اُگائے، خار سمیٹو  
پیڑ اُگاتے، سایہ دیتے



اُس کو تشویش داستاں میں تھی  
اور لکنت مری زباں میں تھی

ایک لپکا سا دھڑکنوں میں تھا  
ایک وحشت سی جسم و جاں میں تھی

ایک کوندا سا آنسوؤں میں تھا  
ایک کھڑکی سی آسماں میں تھی

اُس کے شوکیں میں کھلونے تھے  
نیند پلکوں کے سائباں میں تھی



پیٹنگیں لیتا ہوا بدن اُس کا  
 اور دیوار درمیاں میں تھی  
 میں ہلاکِ خدنگِ قامت تھا  
 ایک قوسِ قزح کماں میں تھی  
 سانپ لپٹے ہوئے تھے شاخوں سے  
 ایک عجب لہر گلستاں میں تھی  
 ایک بستی سوائی مادھوپور  
 حلقہ ہائے پری و شاں میں تھی  
 چاند کے ہاتھ میں کٹورا تھا  
 چاندنی دستِ خاکداں میں تھی  
 میں ابھی تک اُسی مکاں میں ہوں  
 میری تصویر جس مکاں میں تھی  
 اور اب اک خلیجِ حائل ہے  
 پہلے دیوار درمیاں میں تھی

جانے کیا سوچ رہا تھا میں بھی  
اپنے عالم کا خدا تھا میں بھی

وہ بھی کچھ خود سے الگ تھا جیسے  
اپنے سائے سے جدا تھا میں بھی

وہ بھی تھا اک ورقِ سادہ کتاب  
حرفِ بے صوت و صدا تھا میں بھی

صورتِ شاخِ شمر دار تھا وہ  
صورتِ دستِ صبا تھا میں بھی

وہ بھی اک حلقہٴ گرداب میں تھا  
اور بس ڈوب چلا تھا میں بھی

پھول کھلنے کا عجب موسم تھا  
آئینہ دیکھ رہا تھا میں بھی

یہ ہنگامہ بپا کس کے لیے ہے  
یہ شور بے صدا کس کے لیے ہے

یہ کس کی کھوج میں سایا ہے میرا  
یہ مجھ سے بھاگتا کس کے لیے ہے

نکلتے ہیں ستارے کس کی خاطر  
یہ سورج ڈوبتا کس کے لیے ہے

یہ کس کی گونج ہے تارِ نفس میں  
یہ دلِ نغمہ سرا کس کے لیے ہے

یہ گلیاں اس قدر سنسان کیوں ہیں  
یہ گھر آراستہ کس کے لیے ہے

بلا تے ہیں کسے پلکوں کے سائے  
یہ جھونکا نیند کا کس کے لیے ہے

یہ آخر وقت کیا ہے اور کیوں ہے  
یہ عمر بے وفا کس کے لیے ہے  
گزر جاتی ہیں صدیاں ایک پل میں  
یہ پل ٹھیرا ہوا کس کے لیے ہے  
اگر میں ہوں تو میں کس کے لیے ہوں  
خدا ہے تو خدا کس کے لیے ہے  
کسے بتلاؤں کیوں صحرائیں ہوں  
یہ مٹی کا دیا کس کے لیے ہے  
یہ لہریں مضطرب کس کے لیے ہیں  
یہ ساحل جاگتا کس کے لیے ہے  
نکل آئے یہ ہم کس راستے پر  
یہ آخر راستہ کس کے لیے ہے  
مجھے جو جانتا ہے جانتا ہے  
مرے دامن میں کیا کس کے لیے ہے

کیا ہے نصب کس نے راستے میں  
یہ پتھر رہنما کس کے لیے ہے  
یہ تیرا حوصلہ شہر کراچی  
یہ تیرا ولولہ کس کے لیے ہے  
وہ گہما گہمیاں کس کے لیے تھیں  
یہ سناٹا رسا کس کے لیے ہے



رات بھر جھللا کے ڈوب گئے  
زندگی کے افق پہ غم کے دیے  
شہر کا بے کراں یہ سناٹا  
اک قیامت ہے اجنبی کے لیے  
مسکراتے ہیں جگنوؤں کی طرح  
جھیل کی گود میں کنول کے دیے  
یہ درختوں کے بے زباں سائے  
مجھ سے کہتے ہیں ٹھہرنے کے لیے



آتی ہے شام کس نگر سے  
تکتا ہوں راہ دوپہر سے

جی چاہتا ہے ڈوب جاؤں  
آئی ہے لہر یہ کدھر سے

پہلے گرا زمیں پہ سایا  
پھر دھوپ گر گئی شجر سے

گھائل کیا کسی نظر نے  
مرہم ملا کسی نظر سے

دل کیا بجھا کہ روشنی کا  
ایمان گیا چراغ پر سے

کرتا ہوں قتل روز خود کو  
لیتا ہوں کام درگزر سے



یہ کیا ہوا کہ چلتے چلتے  
اوجھل ہوئے تری نظر سے

ایسے خلائورِ غم کی  
مشکل ہے واپسی سفر سے

آجائے کب نہ جانے دریا  
کٹ جائے کب زمیں کدھر سے

پر تولنے لگے پرندے  
منہ موڑنے لگے شجر سے

آندھی کو کیا غرض کہ تنکے  
لائی ہے فاختہ کدھر سے

دل پر کھلا یہ چاندنی میں  
آباد زمین ہے کھنڈر سے

لگتا تو ہے برا مجھے بھی  
چلنا مرا الگ ڈگر سے

کس سوچ میں کھڑے ہو مرزا  
کیا سوچ کر چلے تھے گھر سے

جب تک دورِ جام چلے گا  
ساقی تیرا نام چلے گا

مندر میں زقار چلے گی  
کعبے میں احرام چلے گا

جوگی کا خجواں نہیں تو  
صوفی کا الہام چلے گا

زینہ زینہ ان زلفوں کا  
فتنہ سوئے بام چلے گا

رستے سو اعجاز کریں گے  
جب وہ سرو اندام چلے گا

ستاٹے بھرام کریں گے  
بستی میں کھرام چلے گا

کب تک یہ دن رات چلیں گے

کب تک یہ ابہام چلے گا

کب تک لب خاموش رہیں گے

کب تک یہ ہنگام چلے گا

کیا میری تدبیر چلے گی

کیا میرا اقدام چلے گا

جب تک سر پہ دھوپ کھڑی ہے

سایہ بے آرام چلے گا

کوئی نرم ہوا کا جھونکا

صبح نہیں تو شام چلے گا

ایسے کیسے بات بنے گی

ایسے کیسے کام چلے گا

دنیا کا یہ گورکھ دھندا

کیسے بے ادہام چلے گا

خواب اس کے ہیں جو پُرا لے جائے  
نیند اُس کی ہے جو اُڑا لے جائے  
زُلف اُس کی ہے جو اسے چھو لے  
بات اس کی ہے جو بنا لے جائے  
تیغ اس کی ہے شاخِ گل اس کی  
جو اسے کھینچتا ہوا لے جائے  
اس سے کہنا کہ کیا نہیں اُس پاس  
پھر بھی درویش کی دعا لے جائے  
زخم ہو تو کوئی دہائی دے  
تیر ہو تو کوئی اٹھا لے جائے

قرض ہو تو کوئی ادا کر دے  
ہاتھ ہو تو کوئی چھڑالے جائے

لو دیے کی نگاہ میں رکھنا  
جانے کس سمت راستہ لے جائے

دل میں آباد ہیں جو صدیوں سے  
ان بُنوں کو کہاں خدا لے جائے

کب نہ جانے اُبل پڑے چشمہ  
کب یہ صحرا مجھے بہا لے جائے

خواب ایسا کہ دیکھتے رہے  
یاد ایسی کہ حافظہ لے جائے

میں غریب الدّیّار میرا کیا  
موج لے جائے یا ہوا لے جائے

خاک ہونا ہی جب مقدر ہے  
اب جہاں بختِ تار سا لے جائے



دل نے اپنی زباں کا پاس کیا  
آنکھ نے جانے کیا قیاس کیا

کیا کہا بادِ صبح گا ہی نے  
کیا چراغوں نے التماس کیا

کچھ عجب طور زندگانی کی  
گھر سے نکلے نہ گھر کا پاس کیا

عشق جی جان سے کیا ہم نے  
اور بے خوف و بے ہراس کیا

رات آئی ادھر ستاروں نے  
شبِ نیمی پیرہن لباس کیا

سایہ گل تو میں نہیں جس نے  
گل کو دیکھا نہ گل کو پاس کیا



بال تو دھوپ میں سفید کیے

زرد کس چھاؤں میں لباس کیا

کیا ترا اعتبار تھا تو نے

کیا غضب شہر ناپاس کیا

کیا بتاؤں سب اُداسی کا

بے سبب میں اسے اداس کیا

زندگی اک کتاب ہے جس سے

جس نے جتنا بھی اقتباس کیا

جب بھی ذکرِ غزل چھڑا، اُس نے

ذکر میرا بطورِ خاص کیا

ہوئیں آنکھیں عجب بے حال اب کے

یہ بارش کر گئی کنگال اب کے

ہے وفا شرطِ محبت تو تقاضا کیسا  
میری خاموش نگاہی کو وہ سمجھا کیسا

پا کے اُس بزمِ گہِ ناز میں تنہا خود کو  
تُو نے محسوس کیا ہے دلِ زندہ کیسا

تیشہٴ وقت نے ہر کوہِ گراں کاٹ دیا  
جاں سے لپٹا ہے مگر درد کا رشتہ کیسا

وہ جو اک شخصِ مرے ساتھ چلا تھا گھر سے  
راہ میں چھوڑ گیا ہے مجھے تنہا کیسا

آج کس اوٹ سے نکلا یہ تری یاد کا چاند  
روشنی کا ہے مرے گھر میں یہ ہالا کیسا

اور پھر شہر نے دیکھا کہ سرِ دشتِ وفا  
ابرِ یادوں کا تری ٹوٹ کے برسا کیسا

یوں گنواتا ہے کوئی جن عزیز  
زندگی ہوتی تو ہم رکھتے عزیز

کیا بتائیں اب بکھر جانے کے بعد  
آشیاں تھا یا ہمیں تنکے عزیز

ڈھونڈتا ہے آج کنج عافیت  
دل کبھی جس کو تھے ہنگامے عزیز

حسن تھا اس شہر کا آوارگی  
اور ہمیں تھے پاؤں کے چھالے عزیز

یہ نہ قصہ ہے نہ اندازِ بیاں  
یہ مرا احوال ہے یارِ عزیز

گھر میں جی لگتا نہیں اور شہر کے  
راستے لگتے نہیں اپنے عزیز

اس طرح کیا اے غبارِ دل کوئی  
رقص کرتا ہے سرِ کوئے عزیز

سائے ہیں جتنے گریزاں دھوپ سے  
دھوپ کو ہیں اتنے ہی سائے عزیز

یا تعلق کچھ نہ تھا یا آپ کو  
غم ہمارے ہو گئے اتنے عزیز

سامنے آتے نہیں اور خواب میں  
منہ چھپا لیتے ہیں دُزدانِ عزیز

آنکھ ہے یا سیرِ گاہِ روز و شب  
وقت ہے یا جادۂ عمرِ عزیز

کیا عجب جو درد و غم رخصت ہوئے  
وہ بھی تھے آخر رسا اپنے عزیز

کہاں جاتے ہیں آگے شہر جاں سے  
یہ بل کھاتے ہوئے رستے یہاں سے  
وہاں اب خواب گاہیں بن گئی ہیں  
اُٹھے تھے آب دیدہ ہم جہاں سے  
زمین اپنی کہانی کہہ رہی ہے  
الگ اندیشہ سود و زیاں سے  
انھیں بنتے بگڑتے دائروں میں  
وہ چہرہ کھو گیا ہے درمیاں سے  
اُٹھا لایا ہوں سارے خواب اپنے  
تری یادوں کے بوسیدہ مکاں سے  
میں اپنے گھر کی چھت پر سو رہا ہوں  
کہ باتیں کر رہا ہوں آسماں سے



وہ ان آنکھوں کی محرابوں میں ہر شب  
ستارے ٹانگ جاتا ہے کہاں سے  
رہا اس آبِ نائے روز و شب میں  
دکتے ہیں کنول فانوسِ جاں سے  
☆

نکل کر سایہِ ابرِ رواں سے  
رہے ہم مدّتوں بے سائباں سے  
زمین پر چاند آیا چاہتا ہے  
اُتر کر کشتیِ آبِ رواں سے  
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں رفتگاں کو  
ستارے ٹوٹتے ہیں آسماں سے  
مناتے خیر کیا ہم جسم و جاں کی  
اے چاہا تھا ہم نے جسم و جاں سے  
رہا کس عہدِ ناپڑساں میں ہم نے  
لیا ہے کامِ حرفِ رایگاں سے



چاندنی رات اور لب دریا  
ڈھونڈتا ہے مجھے مرا سایہ

اُس نے رکھا ہمیں شب آوارہ  
ہم نے مصروف چاند کو رکھا

سوچتا ہوں کھڑا ہوا چھت پر  
چاند کس زاویے سے نکلے گا

اُس کو دیکھا ہے بارہا لیکن  
آج دیکھا ہے خواب اُن دیکھا

اس خرابے کی سمت آتے ہوئے  
کس کو دیکھا ہے راستے کے سوا

میرے قصے سنایا کرتا ہے  
میرے بچوں کو پیڑ کا سایہ

آخرِ شب ہے اور ایسے میں  
میرے لب پر کوئی دعا نہ گلہ

یا کبھی حادثات بے معنی  
یا کبھی بات بات پر گریہ

خاک اڑنے لگی ہے آنکھوں میں  
نیند کرنے لگا ہے سناٹا

لوگ مصروف ہو گئے کتنے  
شہر ویران ہو گیا کیسا

دینے والے رفاقتوں کی بھیک  
مانگتے ہیں رفاقتوں کا صلہ

میری قاتل ہے میری تنہائی  
میرا پہ وہم مجھ کو مار گیا

چھپ کے بیٹھا ہوں قرض خواہوں سے  
کر رہا ہوں حساب دُنیا کا

پیش اُس کے چلی نہ عیاری  
رہ گیا شجرۂ نسب رکھا

جوئے آب رواں تری باہنیں  
تیری انگڑائی موڑ دریا کا

ہچ گئے لگی دکانِ دل  
کیسا گاہک دکان میں آیا

کس قدر خود فریب ہوں میں بھی  
کس قدر دل فریب ہے دُنیا

ایک چہرے کے ہیں یہ سب چہرے  
اور کسی سے کوئی نہیں ملتا

دیکھتا ہے گلوب کے اطراف  
پاؤں رکھ کر گلوب پر بچّے

موسم کیس گئیانی ہے  
پتھر پانی پانی ہے  
لہریں کیسی مٹتی ہیں  
ساحل کیسا دانی ہے  
اس بستی کی سچائی  
اس بستی کا پانی ہے  
جو کچھ ہے یاں مایا ہے  
مایا آنی جانی ہے

جاتے جاتے جائے گی  
برسوں کی ویرانی ہے

ہم کیا کم آوارہ ہیں  
رات اگر سیلانی ہے

کچھ تو رستے ایسے ہیں  
کچھ میری بے دھیانی ہے

آجاتی ہے سُولی پر  
نیند بڑی مستانی ہے

اس نخلے میں ہم بھی ہیں  
یہ نخلہ بارانی ہے

اُس کے سات سمندر ہیں  
میری ایک کہانی ہے

آپ رسا سے واقف ہیں  
میرا یارِ جانی ہے



کیا گماں کیا خبر  
اک دھواں سا مگر

اس فضا میں کہاں  
طائرانِ شجر

کیا بساطِ ہوا  
کیا چراغِ ہنر

آسماں سرنگوں  
پائے طاؤس پر

اک عجب بوجھ سا  
میرے اعصاب پر

راہ دکھلا گئیں  
بجلیاں کوند کر

آئینہ رکھ گئی

رات دیوار پر

کھڑکیاں کھولے

آسماں دیکھ کر

خاک میں مل گئی

سب متاع ہنر

قمریاں گلو بہ گلو

راستے در بدر

اب کہاں ڈھونڈیے

روشنی کا شجر

مرجع خلق ہے

ایک تاریک گھر

قرض درویش کیا

ایک درویش پر

ستانا دوپہر سے

بر سے ہے بام و در سے

کیا سیل باد و باراں

گزرے ہے آگ پر سے

اس سایہ بارِ گل کو

نسبت ہے کس شجر سے

کھینچے ہے تیغِ ابرو

گزرے ہے جب ادھر سے

وحشت کرے ہے کیا کیا

مرگانِ رہ گزر سے

بالوں کو اپنے ظالم

باندھے ہے کس ہنر سے

ٹوٹا ہے آج کیا  
آئینہ شیشہ گر سے

ظالم کہا میں اُس کو  
خلقِ خدا کے شر سے

تجھ لب سنی میں خوبی  
گل ہائے تازہ تر سے

کون دل کی زباں سمجھتا ہے  
دل مگر یہ کہاں سمجھتا ہے

میں رات چڑھتا نشتے میں اور نہ جانے کہاں  
مگر وہ شخص کہ جس نے ترا حوالہ دیا

ہم سے پابندیِ آدابِ قفس  
چاہتا ہے تو گرفتار نہ کر

سر پہ انسانیت کا تاج بھی ہے  
عشق کا اپنا اک مزاج بھی ہے

میں تجھے دیکھ کر پریشاں ہوں  
میرے پیش نظر سماج بھی ہے

فاصلے بھی ہیں قربتیں بھی ہیں  
دردِ سر بھی ہے اختلاف بھی ہے

میرے نغموں کی گم شدہ آواز  
سُن سکو تو فضا میں آج بھی ہے

کچھ ترے جسم کے ترنم میں  
میرے شعروں کا امتزاج بھی ہے



زمیں کا بوجھ ہے اس سر پہ آسماں کی طرح  
مجھے سمجھ نہ مرے جسم ناتواں کی طرح

بہت دنوں میں یہ عقدہ کھلا کہ میں بھی ہوں  
فنا کی راہ میں اک نقشِ جاوداں کی طرح

شراب خانہ دل میں یہ کس کی یاد آئی  
خیالِ خاطرِ یارانِ تشنگاں کی طرح

وہ دل نواز تو ہو جس پہ جاں نثار کریں  
ہو امتحانِ محبت تو امتحان کی طرح

ہوئی ہے تم سے ملاقات پر نہ جانے کہاں  
خیال و خواب کی صورت کہ جسم و جاں کی طرح

ہوئے رسا نہ آئے مرزا محتشم علی بیگ  
وگر نہ ہوتے تجمل حسین خاں کی طرح

آدمی سمجھتا ہے زندگی کی قیمت کیا  
مل گئی تو جنت ہے اور وہ بھی جنت کیا  
گا کہوں کی فطرت ہے گا کہوں سے جنت کیا  
جسم کی تجارت میں جان کی رعایت کیا  
یہ زمیں نہ جانے کس دستِ کوزہ گر میں ہے  
اک جہاں ہے گردش میں آب و گل کی قسمت کیا  
چُن رہا ہوں پلکوں سے راستے کے کانٹوں کو  
قرضِ آدمیت ہے فرضِ آدمیت کیا

ضروری ہے خیالِ رفتگاں بھی  
بڑی شے ہے غبارِ کارواں بھی

نہ دے الزامِ بدمستی کہ ساقی  
اُبھر آتی ہیں اکثر تلخیاں بھی

وہاں ہیں آج انساں کی نگاہیں  
جہاں ہے گردِ منزل کھکشاں بھی

عجب ہے رونقِ ویرانہ دل  
کہاں ملتی ہیں ایسی بستیاں بھی

اک افسانہ سا ہو کر رہ گئے ہیں  
رہے تھے کچھ دنوں ہم سرگراں بھی

یہ جو لمحہ دکھائی دیتا ہے  
 خواب ہوتا دکھائی دیتا ہے  
 وہی آہٹ سنائی دیتی ہے  
 وہی سایا دکھائی دیتا ہے  
 نیند آتی نظر نہیں آتی  
 دن نکلتا دکھائی دیتا ہے  
 شہر میں اک ہجوم تنہائی  
 ساتھ چلتا دکھائی دیتا ہے  
 نشہ وصل سے بدن اُس کا  
 آگینہ دکھائی دیتا ہے  
 بھیجنے والا ارمغانِ شراب  
 ہم پیالا دکھائی دیتا ہے

کیا حیا، کیا حجاب، کیا ملبوس  
سب دکھاوا دکھائی دیتا ہے

پیاں بجھتی نظر نہیں آتی  
اُبر کھلتا دکھائی دیتا ہے

چشمِ دہقاں میں خشک آنسو بھی  
آبیانہ دکھائی دیتا ہے

آنکھ جو دیکھتی ہے دیکھتی ہے  
دل تجھے کیا دکھائی دیتا ہے

اب نہ آگے کوئی نشانِ قدم  
اور نہ رستہ دکھائی دیتا ہے

یا ستارے دکھائی دیتے ہیں  
یا اندھیرا دکھائی دیتا ہے

گھر میں تھا کیا رسا جو سارا گھر  
اُلٹا پُلٹا دکھائی دیتا ہے



دریا کل بھی آئے گا

اپنا جشن منائے گا

قطرہ قطرہ بارش کا

ساتھ بہا لے جائے گا

مٹی سونا اُگلے گی

وہ داتا کہلائے گا

سائے چلتے جائیں گے

سورج ڈھلتا جائے گا

آنکھیں نم ہو جائیں گی  
سایا گم ہو جائے گا

کس کو اپنی آنکھوں سے  
اپنے خواب دکھائے گا

کیا رکھا ہے بستی میں  
کس سے سر ٹکرائے گا

اُونچے نیچے ٹیلوں سے  
کب تک جی بہلائے گا

جب تک پتھر بولیں گے  
تو پتھر ہو جائے گا

رنگ ہوا لے جائے گی  
وقت ہوا ہو جائے گا

لہریں باز نہ آئیں گی  
ساحل ہاتھ نہ آئے گا

آنکھ کھلے گی سپنے میں  
سپنے میں سو جائے گا

راگی کیا بیراگی کیا  
اپنا راگ سنائے گا

جیون دکھ کی چھایا ہے  
بیٹھے گا پچھتائے گا

دھیان نہ تھا اُس آنگن میں  
دھیان پڑا رہ جائے گا

پیڑ شگوفے لائیں گے  
چاند ہنڈولا لائے گا

شاخیں جھولا جھولیں گی  
سایا پینگ بڑھائے گا

بوندیں چھم چھم ناچیں گی  
پر بت ڈھول بجائے گا

قصہ گو اٹھ جائیں گے  
سناٹا چھا جائے گا  
کون حنائی ہاتھوں کا  
گل دستہ لہرائے گا  
اب کیا آگے آتا ہے  
آگے دیکھا جائے گا  
عشق ہمارا مرشد ہے  
مرشد راہ دکھائے گا  
دیکھ رسا یہ کلجک ہے  
مان رسا پچھتائے گا

ہاتھ ترا کس شانے پر ہے  
دستک کس دروازے پر ہے  
میرا کیا ہے میں کیوں سوچوں  
دنیا کس صدر ہے پر ہے  
اتنی ہی بس دھوپ ہے میری  
جتنی پیڑ کے سائے پر ہے  
زخمِ دل کی تازہ کاری  
سرد ہوا کے جھونکے پر ہے  
دھرتی اپنے چکر میں ہے  
بادل اپنے دورے پر ہے  
باقی ان سانسوں کا رشتہ  
اُن کے آنے جانے پر ہے



جھلمل جھلمل ایک ستارہ  
 دُور کہیں اک خیمے پر ہے  
 منظر منظر اُس کا چہرہ  
 اب تک دل کے پردے پر ہے  
 کیسا گزرے کیونکر گزرے  
 آنے والے لمحے پر ہے  
 ہر شے کے انداز الگ ہیں  
 ہر شے اک اندازے پر ہے  
 اہل جنوں کی حلقہ بندی  
 زنجیروں کے حلقے پر ہے  
 جانے کن آنکھوں کا چہرہ  
 گلیوں کے سٹائے پر ہے  
 رقصِ غبارِ ناقۃِ لیلیٰ  
 دل کے گاجے باجے پر ہے  
 مرزا صاحب دل کی قیمت  
 گاہک کے دل آنے پر ہے

مئی جب تک نَم رہتی ہے  
 خوشبو تازہ دَم رہتی ہے  
 اپنی رَو میں مست و غزل خواں  
 موج ہوائے غم رہتی ہے  
 اُن جھیل سی گہری آنکھوں میں  
 اک لہر سی ہر دَم رہتی ہے  
 ہر ساز جُدا کیوں ہوتا ہے  
 کیوں سنگت باہم رہتی ہے  
 کیوں آگن ٹیڑھا لگتا ہے  
 کیوں پایل برہم رہتی ہے  
 اب ایسے سرکش قامت پر  
 کیوں تیغِ مژہ خم رہتی ہے  
 کیوں آپ پریشاں رہتے ہیں  
 کیوں آنکھ رسا نَم رہتی ہے

ہوا کس کا تعاقب کر رہی ہے  
یہ ہر فی کیوں زقندیں بھر رہی ہے  
سمندر کی طرح بیکل رہا ہوں  
عجب ہلچل مرے اندر رہی ہے  
کبھی موسم ہلاکو خاں رہے ہیں  
کبھی یلغار بے لشکر رہی ہے  
عمارت غمزہ و ناز و ادا کی  
ستونِ جاں گزاری پر رہی ہے

نہ یہ آنسو کبھی پتھر رہے ہیں  
نہ یہ وادی کبھی بخر رہی ہے  
اُسے دیکھوں تو یوں لگتا ہے جیسے  
کبھی یہ خاک جادوگر رہی ہے  
تراشا ہے اسے بھی تو کسی نے  
یہ مورت بھی کبھی پتھر رہی ہے  
کہیں میں بند ہو کے رہ گیا ہوں  
گھڑی کی سوئی گردش کر رہی ہے  
کسی زخمی پرندے کی طرح چپ  
نظر کمرے کی کھڑکی پر رہی ہے  
بڑائی کیا ہے اس سے مشورے میں  
وہ قتالہ بھی چارہ گر رہی ہے

ادا نا آشنا ہم بھی نہیں ہیں  
یہ کس کافر پہ خلقت مر رہی ہے  
مجھے کیسے بھلا سکتی ہے دُنیا  
مرے خوابوں کی سوداگر رہی ہے  
میں تیرے پیار سے انکار کردوں  
یہ خواہش بھی مرے اندر رہی ہے  
سنا ہم نے بھی ہے ریگِ رواں سے  
کہ یہ بستی بڑی خود سر رہی ہے  
رِسا دیکھے تو کہہ سکتا ہے کوئی  
کبھی یہ آنکھ بے منظر رہی ہے



دیدنی اک جہان ہے، پر کیا  
اس کے در سے اٹھایے سر کیا

اک معتمہ ہے گنبد بے در  
اک کہانی ہے ساتواں در کیا

شہر کا شہر سِلِ آب میں ہے  
راہ میں مجھ غریب کا گھر کیا

ایک مجذوب کی ولایت میں  
پتھروں سے بچایے سر کیا

شام آتے ہی اژدھے کی طرح  
سر سراتی ہے بادِ صر صر کیا

میرے اٹھنے سے جاگ اٹھے گا  
کوئی سویا ہوا مقدر کیا

عمر بھر گردِ رہ گزر کی طرح  
کاٹیے اس گلی کے چکر کیا

روز یادوں کے سائبان تلے  
باندھے آنسوؤں کی جھالر کیا

رینگتا ہے زمین کے اوپر  
کھوجتا ہے زمیں کے اندر کیا

سر پہ کیوں آسماں مسلط ہے  
قرض ہے اس زمیں کے اوپر کیا

جو بھی اب راستے میں آجائے  
کوہ کیا، دشت کیا، سمندر کیا

پاس دارانِ حرف کے آگے  
چل رہی ہے زبانِ خنجر یا

کوئی کہتا نہیں خدا لگتی  
آدمی ہو گیا ہے پتھر کیا

ان لبوں کے سوا بھی ہوتی ہے  
کوئی تعریفِ مصرعہ تر کیا  
اس کھلے آسمان کے نیچے  
یاد آتا نہیں رسا گھر کیا

یوں اُسے طبعِ بدگماں دیکھیں  
مر نہ بائیں جو ناگہاں دیکھیں  
چاند کا خواب دیکھنے والے  
چاندنی رات کا سماں دیکھیں  
تجھ کو دیکھیں کہ جاں نثار ترے  
حاصلِ عمرِ رایگاں دیکھیں  
اب یہی ہے کہ تجھ کو یاد کریں  
اور بس سوئے آسمان دیکھیں

میں نہ تھا اور وہ گھر آیا تھا  
ہائے کیا خواب نظر آیا تھا  
سب ہی آئے تھے تری محفل سے  
کون بادیدہ تر آیا تھا  
قصہ راہ گزر تھا کوئی  
جو سر راہ گزر آیا تھا  
مختصر یہ کہ ترے کوچے سے  
میں تو خاموش گزر آیا تھا  
کیا ستم ہے غمِ جاناں، اب تو  
عشق کرنے کا ہنر آیا تھا

ایک آنسو، ایک لمحہ، ایک خواب  
ہم ہیں اور گرتی ہوئی دیوارِ شب  
کون فریادی ہے یہ مشعل بدست  
کس کی یہ جرأت سرِ دربارِ شب  
کیا یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں  
کون ہے پھر یہ پسِ دیوارِ شب  
داغ ہائے دل وہی ہیں آج بھی  
اور وہی ہے رونقِ گلزارِ شب  
دیکھتے ہیں جاگتے لمحوں کے خواب  
کچھ ستارے ہیں ابھی غمِ خوارِ شب



باغ اُجڑے ہوئے زمانہ ہوا

خونِ دل نذرِ آبیانہ ہوا

خواب اپنی جگہ پرندوں کے

آشیانہ ہوا ہوا نہ ہوا

تیر جب بھی کمان سے نکلا

کوئی معصوم ہی نشانہ ہوا

اس سے پہلے کہ جی قفس میں لگے

منتقل اپنا آب و دانہ ہوا

کس نے توڑا یہ آئینہ دل کا

گوشہ گوشہ نگار خانہ ہوا

میں اسے آج ہو بہو دیکھا  
خواب گویا پیمبرانہ ہوا

اس سے بارِ مرثہ نہیں اٹھا  
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

ایسا اوجھل ہوا کہ آنکھوں سے  
ایک پل کے لیے جدا نہ ہوا

نرم مٹی پہ بادلوں کا گزر  
اب کے موسم میں دلبرانہ ہوا

اس کے آنسو نہیں ستارے ہوئے  
دل نہیں درد کا خزانہ ہوا

ایسا لگتا ہے جیسے آنکھوں کو  
”خواب دیکھے ہوئے زمانہ ہوا“

اس خدا کی زمین پر قبضہ  
ہر زمانے میں غاصبانہ ہوا

خیر مقدم ترے اسیروں کا  
شہر میں کیسا والہانہ ہوا

مجھ کو انکارِ جرمِ عشق نہیں  
فیصلہ گرچہ آمرانہ ہوا

ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کا  
کیا ہواؤں سے دوستانہ ہوا

اب کہیں سچ عیاں نہ ہو جائے  
جھوٹ بولے ہوئے زمانہ ہوا

وہ بھی کیا محفلِ سخن جس میں  
ہم ہوئے، تم ہوئے رسانہ ہوا

نہ طاقِ شب نہ چراغِ سحر کو دیکھتے ہیں  
 یہ خوابِ خواب درپے کدھر کو دیکھتے ہیں  
 ہوا جدھر کی چلے تم اُدھر کو دیکھتے ہو  
 دھواں جدھر سے اُٹھے ہم اُدھر کو دیکھتے ہیں  
 عجیب ہوتے ہیں ظالم ہوا کے جھونکے بھی  
 رِداے گل نہ کلاہِ شجر کو دیکھتے ہیں  
 چھلک رہی ہے مئے ناب آ بگینوں سے  
 کہ دستِ شاخ میں گل ہائے ترکو دیکھتے ہیں  
 یہ رات ہے کہ ستاروں کی انجمن سائیں  
 یہ کشتِ جاں ہے کہ صحرائے تھر کو دیکھتے ہیں  
 بُجھا تھا دل تو چراغاں کیا تھا دنیا نے  
 دُھواں اُٹھا ہے تو دیوار و در کو دیکھتے ہیں  
 نہ دل میں خواہشِ مال و منال ہے مرزا  
 نہ اس نگاہ سے عرضِ ہنر کو دیکھتے ہیں

شہر دل کی سربراہی اور ہے  
آپ کی عالم پناہی اور ہے

زندگی ہے آپ ہی اپنا سفر  
دیکھنے میں گرچہ راہی اور ہے

آپ کا رُوئے سخن اپنی جگہ  
ہم کلامی کا مزا ہی اور ہے

جو سنا وہ قصہ درویش تھا  
داستانِ قصرِ شاہی اور ہے

جس کی خاطر شہر ہے میرے خلاف  
ایک بس اس کی گواہی اور ہے

آنکھ سے اٹھتا نہیں بارِ حیا  
یا جوازِ کم نگاہی اور ہے



کاتبِ تقدیر کا لکھا ہے اور  
نامہٴ شب کی سیاہی اور ہے

یہ کشیدِ خونِ دل ہے محترم  
یہ پیالہ، یہ صراحی اور ہے

عالمِ دریا تہہ دریا ہے اور  
سیرِ گاہِ موج و ماہی اور ہے

دیکھتے چلیے سرِ میدانِ شب  
آنے والا اک سپاہی اور ہے

دل کہو، دریا کہو، صحرا کہو  
کچھ کہو یہ دل بلا ہی اور ہے

طرہٴ نام و نسب اپنی جگہ  
زندگی کی کج گھاہی اور ہے

کل ملے تھے جس رسامِ راز سے ہم  
آج وہ مرزا رسا ہی اور ہے

کہیں انسان بے چہرا کھڑا ہے  
کہیں بے دست و پا سایا پڑا ہے

نہ کوئی پُشت پر ہے زخم ایسا  
نہ سینے میں کوئی خنجر گڑا ہے

جدھر دیکھو اُدھر لاشیں پڑی ہیں  
جہاں جاؤ وہاں تالا پڑا ہے

میں یوں بھی کون سا زندہ تھا پہلے  
جو مرنے کا مرے قصہ گھڑا ہے

برستا ہے نہ ٹلتا ہے یہاں سے  
یہ بادل کس لیے سر پر کھڑا ہے

ابھی ہیں اور ابھی موجیں نہیں ہیں  
یہ ساحل کس تردد میں پڑا ہے  
نہ پینے کے لیے آنسو ہیں باقی؟  
نہ پانی کے لیے کوئی گھڑا ہے  
نہ لوگوں سے شناسائی ہے ایسی  
نہ کوئی نام ہی ایسا بڑا ہے  
تری یادوں کا یہ مہمان خانہ  
زمانہ ہو گیا ویراں پڑا ہے  
یہ صحرا ہے کہ میری زندگانی  
یہ سایہ ہے کہ میرا جھونپڑا ہے  
نظر آتا نہیں کیا پیرہن سے  
کہاں موتی کہاں ہیرا جڑا ہے  
اچانک جیسے پتھر ہو گیا ہو  
رسا کیوں اس طرح گم صُم کھڑا ہے  
(یہاں اس قافیے کو روارکھا ہے)

چلمن ڈالے شب کیسی  
دھوپ دکھائے چھب کیسی

لا یعنی کے صحرا میں  
سیر روز و شب کیسی

اپنی سزا ہم کاٹ آئے  
ہم سے پُرسش اب کیسی

دل کی باتیں دنیا کو  
لگتی ہیں بے ڈھب کیسی

اس کی مرضی وہ جانے  
کب دکھلائے چھب کیسی

بال بنائے کب کیسے  
بیج سجائے کب کیسی

اس کو اپنے مطلب کی  
باتیں یاد ہیں سب کیسی



رُخ گھٹا کا ہے سمندر کی طرف  
اور نظر سب کی مرے گھر کی طرف

چُن رہے تھے لوگ خالی سپیاں  
دیکھتے کیا دیدہ تر کی طرف

ایک لڑکا باغ کی دیوار پر  
ایک بوڑھا ہاتھ پتھر کی طرف

دو کبوتر رات کے ایوان میں  
دو ستارے ایک بستر کی طرف

رقص میں ہے آج طاؤسِ خیال  
پڑ رہا ہے عکس ساغر کی طرف

منتقل ہر دانہ گندم ہوا  
کھیت سے اپنے مقدر کی طرف



دیکھتے ہیں لوگ کس موسم کے خواب  
آئینے رکھ کر سمندر کی طرف

کھینچ رکھا، ہے اُسی دیوار نے  
دائرہ اک اور باہر کی طرف

ہم نے بھی آباد گنجِ دل کیا  
راہ میں سرو و صنوبر کی طرف

اُن لبوں کو لکھ دیا ہوگا گلاب  
دھیان ہوگا مصرعہ ترکی طرف

ایک لمحے کا سفر ہے زندگی  
اپنے پس منظر سے منظر کی طرف

ہم نے کس شہرِ سخن آباد میں  
گھر بنایا میر کے گھر کی طرف

مہرباں ہوفن کی دیوی تو رسا  
چل کے آتی ہے سنجور کی طرف

عکس ہے یا تابانی ہے  
صورت کوئی یعنی ہے

جینا ایک حقیقت ہے  
باقی قصہ خوانی ہے

وقت صریر خامہ ہے  
دنیا ایک کہانی ہے

یہ کیسا ہنگامہ ہے  
یہ کیسی ویرانی ہے

شاخ گل بے دست و پا  
موج گل سیلانی ہے

شکل وہی ہے دریا کی  
لہر کوئی انجانی ہے

دریا ہے یا پیراہن  
عکس ہے یا عریانی ہے

جانے کس کا سایا ہوں  
دھوپ تو آنی جانی ہے

میں وہ نہیں ہوں میں جو ہوں  
میری اور کہانی ہے

اور تو کیا ہے دامن میں  
ایک تھی دامانی ہے

جان تجھے کیا نذر کریں  
جان تو یوں بھی جانی ہے

وحشت ہے یا سرگرداں  
گردِ عمرِ فانی ہے

اپنے آنسو پی کر دیکھ  
نسخہ یہ روحانی ہے

یہ ممکن ہے نیند نہ آئے  
رات تو لیکن آنی ہے

عمر رواں کے کھاتے میں  
جمع و خرچ زبانی ہے

میں کیا میرا قصہ کیا  
بس اک سحر بیانی ہے

پیش نظر ہے آئینہ  
یا تیری پیشانی ہے

قفل نہیں ہے ہونٹوں پر  
قفل کی ایک نشانی ہے

جھلک رہی ہے قامت سے  
وہ جو قیامت آنی ہے

نمین نشیلے، رنگ اس کا  
کچھ گلگوں کچھ دھانی ہے

شاخِ بدن سے لگتا ہے  
مٹی راجستھانی ہے

آگ کہاں سے لایا ہوں  
خاک کہاں کی چھانی ہے

وہ کچھ اور کہانی تھی  
یہ کچھ اور کہانی ہے

وہ میری نادانی تھی  
یہ میری بے دھیانی ہے

ذّرہ ذّرہ ایک عالم  
ایک جہانِ معانی ہے

میں صحرا کا ہوں سلطان  
تخت مرا ویرانی ہے

عمر گزارے عمر ہوئی  
دل میں وہی طغیانی ہے



دیکھ مجھے میں فردا ہوں

خواب میں تیرے آیا ہوں

یہ بھی سچ ہے پیاسا ہوں

یہ بھی سچ ہے دریا ہوں

درد نہیں تو دل کیا ہے

عشق نہیں تو میں کیا ہوں

عمر پڑی ہے رولینا

یار ابھی میں زندہ ہوں

ممکن ہے وہ دوست نہ ہو

دشمن تو میں اپنا ہوں

آگ لگا کر پانی میں

جل کٹیا میں بیٹھا ہوں

پھیل رہی ہے تنہائی

جان رہی ہے تنہا ہوں

شاید دل کی آگ بجھے  
انگاروں پہ چلتا ہوں

میں کیا میری منزل کیا  
ایک ہوا کا جھونکا ہوں

اپنے اور پرانے کیا  
خود سے بھی کب ملتا ہوں

سیرِ گل کو نکلا تھا  
چاکِ گریباں آیا ہوں

آنکھیں یونہی گویا ہیں  
میں یونہی لب بستہ ہوں

لوگ بہ مشکل جاگے ہیں  
آج بہ مشکل سویا ہوں

برسوں اک اک دانے کو  
اک اک بوند کو ترسا ہوں

اب یہ مٹی میری ہے  
اب میں اس کا حصہ ہوں

نام سنا تھا سائیں کا  
بھول ہوئی شرمندہ ہوں

میرا اپنا منصب ہے  
صدر نشین صحرا ہوں

تو بھی ایک معتمہ ہے  
میں بھی ایک معتمہ ہوں

سائے چلتے رہتے ہیں  
آہٹ سنتا رہتا ہوں

قصہ گو سو جاتے ہیں  
میں تنہا رہ جاتا ہوں

یہ کیسا سناٹا ہے  
میں کیسا افسانہ ہوں

ویرانے کو باغ رسا  
شہر کو صحرا لکھتا ہوں

تبیخ ادا کھینچی ہوئی تسمہ پا گئے ہوئے  
کیسے نہ جانے رہ گئے بندِ قبا کھلے ہوئے

چادرِ ماہتاب میں لپٹی ہوئی وہ مطربہ  
شیشہ آبخو میں وہ ساغرِ مے بھرے ہوئے

خواب وہی فقیر کے کھیل وہی لکیر کے  
راہ تھکی تھکی ہوئی نقشِ مٹے مٹے ہوئے

تیرے ہی شہر میں تجھے کاش کبھی دکھائی دے  
لاش کوئی پڑی ہوئی زخمِ ترے دیے ہوئے

فکرِ معاش ہے تمہیں کس کی تلاش ہے تمہیں  
پھرتے ہو شہر میں رسا کس کا پتا لیے ہوئے

نہ دل انگیز تیرا غم ہی ایسا  
 نہ اُبرو باد کا موسم ہی ایسا  
 نہ ایسا رنگِ رخسارِ چمن ہی  
 نہ رنگِ دیدہِ شبنم ہی ایسا  
 مجھے ہی شکوہِ تشنہ لبی ہے  
 کہ میرے جام میں ہے سم ہی ایسا  
 کریں کیا درہمی دل کو اپنی  
 مزاجِ یار ہے برہم ہی ایسا  
 جسے محسوس اب تم کر رہے ہو  
 بہت دن سے ہے کچھ عالم ہی ایسا



شام کے سائے ہیں مائل کس طرف  
اور ہوائے موسمِ دل کس طرف

جا رہی ہے کس طرف بادِ بہار  
اور آوازِ سلاسل کس طرف

کس طرف برپا ہے شورِ زندگی  
سور ہے ہیں لوگ غافل کس طرف

سیلِ شب ٹھیرے تو اندازہ کریں  
ہم کہاں ہیں اور ساحل کس طرف

پھاندیے دیوارِ زنداں کس طرح  
پھینکتے طوق و سلاسل کس طرف

لوگ صف بستہ ہیں یہ جانے بغیر  
کون در پردہ ہے شامل کس طرف

کیجیے کیا رایگانی کا حساب  
جوڑیے کس دن کا حاصل کس طرف

اس جہانِ دشتِ بے آثار میں  
ڈھونڈیے اُس کا مماثل کس طرف

کچھ پتا چلتا نہیں کس راہ میں  
کون ہے دامن کشِ دل کس طرف

سر پہ اوڑھے آبرو مندی کی دھوپ  
جار ہے ہیں یہ قبائل کس طرف

ہو رہے ہیں قتل کن راہوں میں ہم  
چھوڑ آئے جادۂ دل کس طرف

کاش اتنا جانتے یہ راستے  
کس مسافر کی ہے منزل کس طرف

آگئی تو کس طرف شامِ فراق  
رنگ پر ہے آج محفل کس رَف

کھل رہی ہے کس طرف سرما کی دھوپ  
رنگ چہرے کا ہے مائل کس طرف

لے رہی ہے زندگی انگڑائیاں  
ہیں پر پرواز مائل کس طرف

دیکھنا یہ ہے سرِ محفل رِسا  
دیکھتا ہے جانِ محفل کس طرف

رات ہم نے جہاں بسر کی ہے  
یہ کہانی اُسی شجر کی ہے

یہ ستارے یہاں کہاں سے آئے  
یہ تو دہلیز میرے گھر کی ہے

نیند کیا کیجیے کہ آنکھوں میں  
اک نئی جنگ خیر و شر کی ہے

میرے کچے مکان کے اندر  
آج تقریبِ چشمِ تر کی ہے

ہجر کی شب گزر ہی جائے گی  
یہ اُداسی تو عمر بھر کی ہے

عشق اپنی جگہ مگر ہم نے  
منتخب اور ہی ڈگر کی ہے

اُٹھ رہا ہے دھواں مرے گھر میں  
آگ دیوار سے اُدھر کی ہے  
ہم نے اپنے وجود کی چادر  
تنگ اپنے گمان پر کی ہے  
وہ ستارہ شناس ایسا تھا  
یا کسی نے اُسے خبر کی ہے  
جار ہے ہو کدھر رسا مرزا  
دیکھتے ہو ہوا کدھر کی ہے



ہاتھ میں خنجر آ سکتا ہے  
یا پھر ساغر آ سکتا ہے  
آنکھیں زخمی ہو سکتی ہیں  
ذرہ اڑ کر آ سکتا ہے  
چھت کے اوپر سونے والے  
سورج سر پر آ سکتا ہے



خواب میں آنے والا اک دن  
خواب سے باہر آ سکتا ہے

کالا جادو کرنے والا  
مشعل لے کر آ سکتا ہے

سارے منظر چھپ سکتے ہیں  
ایسا منظر آ سکتا ہے

شاید کوئی آنے والا  
لمحہ بہتر آ سکتا ہے

گھر کا رستہ بھولنے والا  
چوراہے پر آ سکتا ہے

مٹی ہجرت کر سکتی ہے  
دریا چل کر آ سکتا ہے

نام جو بھی ہو نسب جو بھی ہو  
تھا وہ اک شخص عجب جو بھی ہو

چاند نکلا ہے سرِ شاخِ گلاب  
یا پسِ نیمہ شب جو بھی ہو

مجھ میں جو شخص چھپا بیٹھا ہے  
مجھ سے کہتا ہے کہ اب جو بھی ہو

رقص جاری رہے تاروں سے کہو  
معرکہ آخرِ شب جو بھی ہو

مسئلہ میرا رفاقت ہے رسا  
مذہبِ بنتِ عنب جو بھی ہو

عمر گزری رہ گزر کے آس پاس  
رقص کرتے اُس نظر کے آس پاس

زُلف گھلتی ہے تو اٹھتا ہے دُھواں  
آبشارِ چشمِ تر کے آس پاس

کوندتی ہیں بجلیاں برسات میں  
طاؤرِ بے بال و پر کے آس پاس

رات بھر آوارہ پتے اور ہوا  
رقص کرتے ہیں شجر کے آس پاس

چھوڑ آیا ہوں متاعِ جاں کہیں  
غالباً اُس رہ گزر کے آس پاس  
بال بکھرائے یہ بوڑھی چاندنی  
ڈھونڈتی ہے کیا کھنڈر کے آس پاس  
اُس گلی میں ایک لڑکا آج بھی  
گھومتا رہتا ہے گھر کے آس پاس  
ایک صورت آشنا سائے کی دھوپ  
پڑ رہی ہے بام و در کے آس پاس  
کیسے پڑ اسرارِ چہرے ہیں رسا  
خواب گاہِ شیشہ گر کے آس پاس

ہر ہر قدم پہ سایہ زنجیر دیکھ کر  
ہم خوش ہیں اپنے خواب کی تعبیر دیکھ کر

یہ شہر بے اماں سے  
یہ لوگ رایگاں سے  
یہ شور مضحک سا  
یہ پیڑ نیم جاں سے  
یہ عمر مختصر کے  
انداز بے کراں سے

ہیبت زدہ سمندر  
خاموش بادباں سے

جمہور دل گرفتہ  
انسان بے زباں سے

امواج پاپہ جولاں  
ساحل رواں دواں سے



تقدیر روشنی کی

وابستہ خاکِ داں سے

ہر شام اک ستارہ

نکلے ہے آسماں سے

ہر شام اک جہنم

گزرے ہے درمیاں سے

آیا رسا غزل میں

آتش کدہ کہاں سے

بے طور جاں گنوا دی خود آپ ہم نے ورثہ

کیا تم سے ناز اٹھتے دل ایسے سرگراں کے

خوبو سے تیری آخر ہم بھی تو آشنا ہیں

جانے سنا رہی ہے قصے صبا کہاں کے

تیر جیسے کمان کے آگے  
موت کڑیل جوان کے آگے

بادشاہ اور فقیر دونوں تھے  
شہر میں اک دکان کے آگے

چلتے چلتے زمین رُک سی گئی  
ناگہاں اک مکان کے آگے

ہم بھی اپنا مجسمہ رکھ آئے  
رات اندھی چٹان کے آگے

طشتِ جاں میں سجا کے رکھنا تھا  
حرفِ دل مہیمان کے آگے

کیا عجب شخص ہے کہ بیٹھا ہے  
دھوپ میں سائبان کے آگے

ہم کسی کو گواہ کیا کرتے  
اس کھلے آسمان کے آگے ۔

کب تک جھوٹ بولتے صاحب  
اس طرح خاندان کے آگے

کون کہتا رسا خدا لگتی  
ایسے کافر گمان کے آگے

عارضوں کو ترے کنول کہنا  
اتنا آساں نہیں غزل کہنا

ہم بھی بیٹھے ہیں گوش بر آواز  
رفتگاں سے ذرا اجل کہنا

آج موضوع گفتگو ہے حیات  
اب کوئی اور بات کل کہنا

کس طرف کوچ کر گئے پیارے  
کیا ہوئے روشنی کے مینارے

کون ایسا خدا کا دشمن ہے  
سر پہ منڈلا رہے ہیں طیارے

ظلم کی چل رہی ہے پن چکی  
عدل کے بج رہے ہیں نقارے

سوکھنے کے قریب ہے دریا  
ڈوبنے کے قریب ہیں تارے

اک لڑی میں پرودے کس نے  
آدمی، دشت، پھول، سیارے

جانے کن جنگلوں سے در آئے  
شہر تنقید میں لکڑہارے

چاند ہوتا نہیں ہر اک چہرہ  
پھول ہوتے نہیں سخن سارے

کس جہنم کا رزق ہوں مرزا  
کس لیے چن رہا ہوں انگارے

عمر گزری روتے لیکن ایسا سناٹا نہ تھا  
میں نہ تھا کل رات یا وہ میرا ہم سایہ نہ تھا

موج یوں آئی کہ آئی اور کنارہ کش ہوئی  
جیسے کوئی تشنہ لب، تشنہ لب دریا نہ تھا

وہ تو کہیے ہم ہی کچھ دامن کش دنیا رہے  
ورنہ کاروبار دنیا میں کوئی گھاٹا نہ تھا



اے خداوندِ ذوالجلال، مجھے

ہو چلا ہے جنوں، سنبھال مجھے

رات لگتی ہے خواب دریا کا

نیند، سرگوشیوں کا جال مجھے

رات اک شخص آئینہ تمثال

دے گیا اپنے خدّ و خال مجھے

وہ ستارہ نژاد سونپ گیا

کس خرابے کی دیکھ بھال مجھے

اب کسی خواب کے درتپے سے

دیکھ اے گردِ ماہ و سال مجھے

زندگی کا مطالبہ کیا ہے

کیوں بنایا ہے یرغمال مجھے

وہ ابھی خواب تھا کہ آنکھوں نے  
دیکھنا کر دیا محال مجھے  
ایک ایسی ہی شام تھی وہ بھی  
یاد ہے، طائرِ خیال مجھے  
پہلے اُس نے رسا چراغ دیا  
اور پھر منصبِ وصال مجھے



جُز عشق کوئی اور مرے کام نہ آیا  
جب تک کہ نہ تڑپا مجھے آرام نہ آیا  
اس زلفِ سیاہ تاب نے بل کھائے ہیں کیا کیا  
جب تک دلِ آوارہ تر دام نہ آیا  
جلنے کو جلے ہم بھی تری بزم میں لیکن  
ہم سوختہ جانوں کا کہیں نام نہ آیا  
مائل بہ کرم کب نگہِ ناز نہیں تھی  
تجھ کو ہی سلیقہ دلِ ناکام نہ آیا

اپنی بے چہرگی میں پھر تھا  
آئینہ بخت میں سکندر تھا

سرگزشتِ ہوا میں لکھا ہے  
آسمانِ ریت کا سمندر تھا

کس کی تصنیف ہے کتابِ دل  
کون تالیف پر مقرر تھا

کچھ تو واضح نہ تھی تری صورت  
اور کچھ آئینہ مکدر تھا

وہ نظرِ خضرِ راہِ مقتل تھی  
اُس سے آگے مرا مقدر تھا

رات آغوشِ دیدہ تر میں  
عکسِ آغوشِ دیدہ تر تھا  
یہ قدم اُس گلی کے لگتے ہیں  
جس گلی میں کبھی مرا گھر تھا

میں نے پوچھی نہ اُس نظر سے کہی  
وہ جواک بات نامہ بر نے کہی  
زندگی کا سفر کٹا تنہا  
اک کہانی سی رہ گزرنے کہی  
سل گئے لب تو داستانِ جنوں  
داغ ہائے دل و جگر نے کہی  
دل کا ہر زخم تھا لب گویا  
کیا نئی بات چارہ گر نے کہی

کچھ نہ کچھ سوچتے رہا کیجیے  
آسمان دیکھتے رہا کیجیے

چار دیواری عناصر میں  
کودتے پھاندتے رہا کیجیے

اس تحیر کے کارخانے میں  
انگلیاں کاٹتے رہا کیجیے

کھڑکیاں بے سبب نہیں ہوتیں  
تاکتے جھانکتے رہا کیجیے

راستے خواب بھی دکھاتے ہیں  
نیند میں جاگتے رہا کیجیے

فصل ایسی نہیں جوانی کی  
دیکھتے بھالتے رہا کیجیے



آئینے بے جہت نہیں ہوتے  
عکس پہچانتے رہا کیجیے  
زندگی اس طرح نہیں کٹتی  
وقت اندازتے رہا کیجیے  
ناسپاسانِ علم کے سر پہ  
گپڑیاں باندھتے رہا کیجیے

کوئی درد آشنا نہیں نہ سہی  
درد تو ہے، دوا نہیں، نہ سہی  
رات یوں بھی گزر رہی جائے گی  
دھڑکنوں کی صدا نہیں، نہ سہی

روز آ کر گلے سے لگتے ہیں

خواب پھر بھی نئے سے لگتے ہیں

زندگی فلسفہ سا لگتی ہے

آپ جب سوچنے سے لگتے ہیں

جال اپنی جگہ ستاروں کے

دیکھنے میں بھلے سے لگتے ہیں

شہر سایہ زدہ سا لگتا ہے

راستے اژدھے سے لگتے ہیں

سوچے تو خیال کے اطراف

آئینے گھومنے سے لگتے ہیں

اک طرف کائنات کے اَسرار  
ہاتھ باندھے ہوئے سے لگتے ہیں

وقت آموختہ سا لگتا ہے  
اور ہم بھولنے سے لگتے ہیں

اور اب اس غزل سرائی میں  
روز و شب قافیے سے لگتے ہیں

اُن ستارہ نژاد آنکھوں میں  
اپنے ہی رتجگے سے لگتے ہیں

شعر ہم نے سُنے رسا تیرے  
واقعی اُن کہے سے لگتے ہیں

ہوئیں آنکھیں عجب بے حال اب کے  
یہ بارش کر گئی کنگال اب کے

میر جی سے اگر ارادت ہے  
 قولِ ناسخ کی کیا ضرورت ہے  
 کون پوچھے یہ میر صاحب سے  
 ان دنوں کیا جنوں کی صورت ہے  
 چاند کس مہ جہیں کا پر تو ہے  
 رات کس زلف کی حکایت ہے  
 کیا ہوئے بہارِ تازہ ہے  
 کیا چراغِ سرائے عبرت ہے  
 زندگی کس شجر کا سایہ ہے  
 موت کس دشت کی مسافت ہے  
 آگ میں کیا گلِ معانی ہیں  
 خاک میں کیا نمو کی صورت ہے

کیا پس پردہ توہم ہے  
کیا سر پردہ حقیقت ہے  
اس کہانی کا مرکزی کردار  
آدمی ہے کہ آدمیت ہے  
کاشا ہوں پہاڑ سے دن رات  
مسئلہ عشق ہے کہ اجرت ہے  
پھر محبت کا فلسفہ کیا ہے  
یہ اگر سب لہو کی وحشت ہے  
ایک تو جاں گیل ہے تنہائی  
اُس پہ ہمسائیگی قیامت ہے  
اور جیسے اُسے نہیں معلوم  
شہر میں کیا ہماری عزت ہے  
اُس نے کیسے سمجھ لیا کہ مجھے  
خواب میں جاگنے کی عادت ہے



گھر سے شاید نکل پڑے وہ بھی  
آج کچھ دھوپ میں تمازت ہے

ہم یونہی مبتلا سے رہتے ہیں  
یا کسی آنکھ کی مروّت ہے

میر بولے سنو رسا مرزا  
عشق تو آج بھی صداقت ہے

اس جہانِ بلند و پست کے بیچ  
کچھ اگر ہے تو اپنا قامت ہے

موسموں کے اثر تلے کیا کیا  
رنگ پھوٹے شجر تلے کیا کیا

رشتہ جسم و جاں بھی ہوتا ہے  
 ٹوٹنے کا گماں بھی ہوتا ہے  
 اس توہم کے کارخانے میں  
 کارِ شیشہ گراں بھی ہوتا ہے  
 ہم سے عزت نشیں بھی ہوتے ہیں  
 عرصہ لامکاں بھی ہوتا ہے  
 ہم بھی ہوتے ہیں اُس کی محفل میں  
 رقصِ سیارگاں بھی ہوتا ہے  
 بادِ صحرائے جاں بھی ہوتی ہے  
 نغمہ سارباں بھی ہوتا ہے  
 جوئے آبِ رواں بھی ہوتی ہے  
 عکسِ سروِ رواں بھی ہوتا ہے

پھول کھلتے بھی ہیں سرِ مرغاں  
چاندنی کا سماں بھی ہوتا ہے  
لوگ مل کر بچھڑ بھی جاتے ہیں  
اور یہ ناگہاں بھی ہوتا ہے  
چشمِ آئینہ ساز میں شاید  
آئینے کا گماں بھی ہوتا ہے

ہم چلے جاتے ہیں یا پھر شام کو  
ملنے آ جاتے ہیں یارانِ عزیز

میرا اک چھوٹا سا گھر ہے  
گھر کے اندر ایک شجر ہے

ایک شجر ہے جس کا سایہ  
ننگے پاؤں ننگے سر ہے

میرا تعاقب کرنے والی  
اک انجانی راہ گزر ہے

ہر دامن ہے وقت کا دامن  
ہر دامن میں گردِ سفر ہے

اس بستی کے لوگ ہیں کیسے  
پوچھ رہے ہیں کون نگر ہے

سچ کا زہر پیا ہے کس نے  
کہنے کو اک بات مگر ہے

میرے بچے پھول سے بچے  
کن شانوں پر میرا سر ہے

سامنے گھر ابھی نہیں آیا  
ایسا منظر ابھی نہیں آیا

زخمِ دل کے ابھی نہیں مہکے  
وہ گلِ تر ابھی نہیں آیا

دورِ تشنہ لبی نہیں گزرا  
دورِ ساغر ابھی نہیں آیا

سامنے ہے درختِ بیری کا  
اور پتھر ابھی نہیں آیا

یا ابھی بادِ باں نہیں کھولے  
یا سمندر ابھی نہیں آیا

لوٹ آئے طیورِ آوارہ  
اور رسا گھر ابھی نہیں آیا



میں جس دل میں ملیں ہوں گھر ہے میرا  
محبت بویا بستر ہے میرا

پڑی ہے کشتِ جاں بے آب کب سے  
کنایہ تجھ سے چشمِ تر ہے میرا

مری آنکھوں میں ہیں سب خواب میرے  
مری آنکھوں میں پس منظر ہے میرا

مری اقلیم، اقلیمِ خن ہے  
مرا فرمانِ شعرِ تر ہے میرا

کوئی کہہ دے حریفانِ غزل سے  
غزل کیا ہے، یہ دردِ سر ہے میرا

مجھے تنہا نہ سمجھو ساتھ میرے  
خدائے افضل و برتر ہے میرا

طلب کرتے ہیں مجھ سے حرفِ میرے  
رسا وہ قرض جو مجھ پر ہے میرا

جسم بدلے گا جان بدلے گا

وہ مرا ہر گمان بدلے گا

ایک کردار ہے کہانی کا

جو کہیں درمیان بدلے گا

وہ اچانک کہیں سے آئے گا

اور مری داستان بدلے گا

اک سمندر نژاد آوارہ

خار و خس کا جہان بدلے گا

یا زمیں اپنا بوجھ بدلے گی

یا شجر سائبان بدلے گا

سب سیاق و سباق بدلیں گے

یا فقط آسمان بدلے گا

یا وہ کوئی دلیل لائے گا

یا پھر اپنا بیان بدلے گا

ایسا لگتا ہے یہ کرایہ دار

منہ اندھیرے مکان بدلے گا

جانے کب اُس کی یاد آئے گی

جانے کب میرا دھیان بدلے گا

سیکھا ہے ابھی تو پاؤں چلنا

چلنے کا ارادہ کر رہا ہوں

رات ہے یا ہوا مکانوں میں  
جَل رہا ہے دیا مکانوں میں  
جانے کیا ہو گیا مکینوں کو  
جانے کیا ہو گیا مکانوں میں  
لوگ کن واہموں میں رہتے ہیں  
کاٹتے ہیں سزا مکانوں میں  
اک ستارہ زمین پر اُترا  
اور پھر کھو گیا مکانوں میں  
ایک سائے سے روز ہوتا ہے  
آمنا سامنا مکانوں میں  
ان ستاروں کا مشغلہ ہے رسا  
تا کنا جھانکنا مکانوں میں

وہ بھی سب کی نظر میں آئے گا  
اور جو کچھ شجر میں آئے گا

بوجھ سر پہ اٹھائے سورج کا  
کون اس دوپہر میں آئے گا

اُس پہ معنی کھلیں گے قامت کے  
جب حصارِ نظر میں آئے گا

کیا خبر تھی چراغِ زخمِ ہنر  
دستِ دریوزہ گر میں آئے گا

کون سمجھے گا زندگی میری  
کون اس رہ گزر میں آئے گا

ہر قدم اک نئی جہت ہوگی  
ہر ستارہ سفر میں آئے گا



عکس اپنے وجود سے پہلے  
جملہ شیشہ گر میں آئے گا

شور پتوں کی سرسراہٹ کا  
خواب گاہِ سحر میں آئے گا

چور دل کا کسی درتپے سے  
ایک دن چشمِ تر میں آئے گا

گر یہی روز و شب رہے تو رسا  
کون پھر اس نگر میں آئے گا

صحرائے بے خیال میں جل تھل کہاں کے ہیں  
آخر ہوائے شوق یہ بادل کہاں کے ہیں

محبت خبط ہے یا وسوسہ ہے  
مگر اپنی جگہ یہ واقعہ ہے

جسے ہم واہمہ سمجھے ہوئے ہیں  
وہ سایہ بھی تری دیوار کا ہے

مکاں سرگوشیوں سے گونجتے ہیں  
اندھیرا روزنوں سے جھانکتا ہے

درد دیوار چپ سادھے ہوئے ہیں  
فقط اک عالم ہو بولتا ہے

مری آنکھوں پہ عینک دوسری ہے  
کہ یہ تصویر کا رخ دوسرا ہے  
سنا ہے ڈوبنے والے نے پہلے  
کسی کا نام ساحل پر لکھا ہے  
گزر کس کا ہوا ہے جواب بھی تک  
دو عالم آئینہ بردار سا ہے  
یہ دنیا مٹ گئی ہوتی کبھی کی  
مگر اک نام ایسا آگیا ہے  
محبت ہے رسا میری عبادت  
یہ میرا دل مرا دستِ دعا ہے

ایک راہ خیال پر تنہا

میں ادھر اور وہ ادھر تنہا

ہم نے دیکھے ہیں شام کے سائے

ہم نے کاٹی ہے دوپہر تنہا

زندگی اور اس قدر مصروف

آدمی اور اس قدر تنہا

خواب اپنے نہ وادیاں اپنی

یہ نکل آئے ہم کدھر تنہا

بس یہیں تک تھا قصہ درویش  
یعنی آگے ہے اب سفر تنہا

پھر وہی دھوپ پھر وہی سائے  
بستی بستی، نگر نگر تنہا

پھر وہی موسمِ شجرِ کاری  
پھر وہی شاخِ بے ثمر تنہا

چاند تھا وہ کہ جل رہا تھا، رات  
بچ دریا میں کوئی گھر تنہا

کس بھری دوپہر میں بیٹھا ہے  
راہ میں سایہ شجرِ تنہا

انقلابات ہیں زمانے کے  
ورنہ تم اور میرے گھر تنہا



خاک اُڑتی ہے اس جہان میں کیا  
پھول کھلتے ہیں آسمان میں کیا

عشق تیرے خیال میں کیا ہے  
زندگی ہے ترے گمان میں کیا

ہاتھ دوش ہوا پہ رکھتا ہے  
پاؤں رکھتا ہے پائندان میں کیا

میں جو حیرت زدہ سا رہتا ہوں  
بات آتی ہے تیرے دھیان میں کیا

نیند آرام کر رہی ہے ابھی  
تیری پلکوں کے سائبان میں کیا

تیر جو اک تری کمان میں تھا  
ہے ابھی تک تری کمان میں کیا

کیا ہوئے وہ شکست خوردہ لوگ  
آگئے سب تری امان میں کیا

تجھ سے یہ تیرے حاشیہ بردار  
اور کہتے بھی میری شان میں کیا

پوچھتا ہے مکاں کا سناٹا  
میں ہی رہتا ہوں اس مکان میں کیا

آکے ساحل پہ نامراد ہوا  
منہ چھپاتی ہے بادبان میں کیا

اس جہانِ خراب کی صورت  
ہے کوئی اور تیرے دھیان میں کیا

ہم ہیں خود آپ روبرو اپنے  
اور ہیں خود ہی درمیان میں کیا

وہ جو کھڑکی کھلی سی رہتی ہے  
جھانکتی ہے مرے مکان میں کیا

حال اپنا بھی کیا یہی ہوگا .  
ذکر آئے گا داستان میں کیا

جب کیے دکھ بیاں اسی سے کیے  
بات ایسی ہے اس چٹان میں کیا

اچھے لگتے ہیں آن بان کے لوگ  
جانے ہوتا ہے آن بان میں کیا

دل سے جب دل کلام کرتا ہے  
لفظ آتے ہیں درمیان میں کیا

کیا ہوئے میرے خاندان کے لوگ  
ایک میں ہی تھا خاندان میں کیا

جمع کیجیے نہ درد و غم تو رسا  
کیجیے اور اس جہان میں کیا

ٹوٹ کر پیار کیوں نہیں کرتا  
کھل کے اظہار کیوں نہیں کرتا  
نقل کرتا ہے قصہ درویش  
اپنا کردار کیوں نہیں کرتا  
سر اٹھانے لگی ہیں دیواریں  
ان کو مسمار کیوں نہیں کرتا  
یہ ترے ہاتھ کی لکیریں ہیں  
تو انھیں پار کیوں نہیں کرتا  
کیا ہوئی صید افگنی تیری  
لوٹ کر وار کیوں نہیں کرتا  
روز سامانِ قتل کرتا ہے  
قتل اک بار کیوں نہیں کرتا  
وادی گل تلاش کرتا ہے  
سیر گھسار کیوں نہیں کرتا  
یار تو کس ہوا میں رہتا ہے  
اپنا گھر بار کیوں نہیں کرتا

کیا کوئی خواب سجائے میرے  
دھوپ میری ہے نہ سائے میرے  
نہ کھلے بند نقاب ہستی  
کچھ نہ کام آئے کنائے میرے  
وہ پری زاد تھی لیکن اس نے  
ناز پلکوں سے اٹھائے میرے  
وادی خواب میں بسنے والے  
خواب تک دیکھ نہ پائے میرے  
روز ہوتے ہیں ہویدا مجھ سے  
یہ شب و روز یہ سائے میرے  
میں یونہی ہاتھ اٹھائے رکھوں  
چاہے کچھ ہاتھ نہ آئے میرے



پوچھتے ہیں متاعِ درد کا مول  
کوئی دیکھے تو گا کہوں کے ٹھٹھول

پیار ہم نے کیا ہے تیرے نال  
اک یہی ہے سند ہمارے کول

ہم بھی آخر ترے دعاگو ہیں  
ہم فقیروں سے بھی کبھی ہنس بول

راستے سے گزر گئے دونوں  
وہ تہی دست میں تہی کشلول

دُور کوہِ ندا پہ اک آواز  
اور سڑکوں پہ بھیڑیوں کے غول

دیکھ یہ لوگ کچھ الگ سے ہیں  
ان کو میزانِ عام پر مت تول

تیری آواز میں تجھے دیکھوں  
رنگ اپنے سماعتوں میں گھول

گو نجتے ہیں ہنوز یادوں میں  
تیری آنکھوں کے اُن کہے دو بول

گھر کے اندر مُہیب سناٹا  
اور باہر منادیوں کے ڈھول

یہ توازنِ عدم توازن ہے  
یا کہیں رہ گیا ہے کوئی جھول

سر اٹھاتا ہے چراغِ دل تو جل جاتی ہے شام  
کھینچتا ہوں دامنِ دل تو نکل جاتی ہے شام

غازہ رخسار کی صورت مہک اٹھتی ہے دھوپ  
دیکھ کر کنج لبِ جاناں مچل جاتی ہے شام

روزِ در آتا ہے کوئی روزِ دیوار سے  
یا مرے کمرے کی تصویریں بدل جاتی ہے شام

ایک سایہ سا اُبھرتا ہے فضا میں اور پھر  
شہر کی آوارہ سڑکوں پر نکل جاتی ہے شام

آسرے پہ شام کے مرتا ہے دن بھر آدمی  
اور سنبھلنے بھی نہیں پاتا کہ ڈھل جاتی ہے شام

ڈھیر کر جاتی ہے مجھ کو اور پھر اُس ڈھیر میں  
رکھ کے کچھ چنگاریاں آگے نکل جاتی ہے شام

یہ سنہرے کھیت، دریا، شہر، جنگل، وادیاں  
ایک پل میں سیکڑوں منظر بدل جاتی ہے شام

راکھ ہو جاتا ہے سورج آپ اپنی آگ میں  
اور چوبِ خشک کے مانند جل جاتی ہے شام  
تتلیوں کے پیچھے پیچھے جیسے بچے کا خیال  
دُور بستی سے کسی جانب نکل جاتی ہے شام



زُلفِ مرکز سے بٹے  
ابرِ بر سے تو چھٹے

رات زنجیر نہیں  
اور کاٹے نہ کٹے

کوئی قصہ ہی کہو  
دوستو رات کٹے

منزلیں آپ بڑھیں  
جب نگہبان ہٹے

اب جو ہونا ہے رسا  
ہو رہے پاپ کٹے



ملتی کیا تعمیر خواب  
خواب تھا گنجلک پہلے ہی  
تن کی چوکھٹ چاٹ چکی  
من کی دیمک پہلے ہی  
پایل بھی خاموش ہوئی  
چپ تھی ڈھولک پہلے ہی  
سائیں گھر کی حالت دیکھ  
رہن ہے اجرک پہلے ہی  
دل ہی دشمن جاں نکلا  
مجھے تھا یہ شک پہلے ہی



سرگرداں ہے دل کے ساتھ  
اک شب چٹک پہلے ہی

بچ بچیا چھوڑ آیا  
دھن دھن تک تک پہلے ہی

شام بھی کم احوال ہوئی  
شام کی بیٹھک پہلے ہی

نیند گئی آرام گیا  
تکیہ، توشک پہلے ہی

کون سے ایسے گاہک تھے  
دل کے گاہک پہلے ہی

آگ سیٹے بیٹھی ہے  
شام کی ٹھنڈک پہلے ہی

شہرِ کراچی یاد ہے تجھ کو تیرے شب بیداروں میں  
 کوئی رسا چغتائی بھی تھا یار ہمارا یاروں میں  
 ان گلیوں ان بازاروں کی نوک پلک کے متوالے  
 کیسے کیسے لوگ تھے جن کے نام مچھے اخباروں میں  
 کس پہ کتابِ دل اُتری اور کس نے اسمِ عشق پڑھا  
 کس نے یہاں بسرام کیا ان حرف و صوت کے غاروں میں  
 نوکِ سناں کی صورت دیکھے رات کو ہم نے تارے بھی  
 رات کو ہم نے چاند بھی دیکھا تیرے پہرے داروں میں  
 اس بستی کے پس منظر میں دُور تلک دیواریں ہیں  
 اور کسی نے چُن رکھے ہیں سائے ان دیواروں میں  
 اور طنابِ خیمہ شب کو کھینچ کے باندھو لفظوں سے  
 اور گھٹن کو موسم لکھو شاہوں کے درباروں میں

جانے کیا دیدہ تر لے آئے  
یہ بھی ممکن ہے سحر لے آئے

میں نے زلفوں کی مہک مانگی تھی  
لوگ شاخِ گل تر لے آئے

رن پڑا کوچہ قاتل میں تو لوگ  
سامنے اپنے سپر لے آئے

پھر جو لوٹے تو قبیلے والے  
اپنے سردار کا سر لے آئے

پھر اُسے لوٹ کے آنا پڑ جائے  
اور یہی راہ گزر لے آئے

وہ پتا بھول گیا ہے شاید  
کوئی اُس کو مرے گھر لے آئے

میں یہ کہتا ہوں کہ تاریخِ بشر  
پھر کوئی ایسا بشر لے آئے

زندگی کے سراب بھی دیکھوں  
نیند آئے تو خواب بھی دیکھوں

رات کاٹوں کسی خرابے میں  
منہ اندھیرے گلاب بھی دیکھوں

حرفِ تازہ ورق ورق لکھوں  
سادہ دل کی کتاب بھی دیکھوں

ڈوب جاؤں کسی سمندر میں  
پھر جزیروں کے خواب بھی دیکھوں

زندگی میں حماقتیں بھی کروں  
اس کا پھر سدِ باب بھی دیکھوں

آج دل کی بیاض میں لکھ کر  
لفظ خانہ خراب بھی دیکھوں

پیاں دل کی بجھاؤں آنکھوں سے  
رقص کرتے حباب بھی دیکھوں



تم کو میری یاد آئے گی، آئے گی پچھتانا ہوگا  
لیکن ایسا کیوں کر ہوگا، ہوگا بھی تو اب کیا ہوگا

اُس دم میرے ان اشکوں کی یہ سوندھی خوشبو مہکے گی  
ہلکی ہلکی بارش میں جب کوئی تنہا تنہا ہوگا

ناہت گل کا نغمہ ہو یا دل کے دھڑکنے کی آہٹ ہو  
سننے والے سُن ہی لیں گے شہر میں جب سناٹا ہوگا

دور گیا تلوار کے فن کا فنِ سخن کی بات کریں اب  
آپ مغل ہیں مرزا صاحب جو ہر تو دکھلانا ہوگا



جام بولیں گے سبُو بولے گا

تشنہ کاموں کا لہو بولے گا

ہم نہ بولیں گے سرِ بزم تو کیا

آپ وہ آئینہ رُو بولے گا

یہ تو سوچا بھی نہ تھا جانِ بہار

پھول مہکیں گے نہ تو بولے گا

زخم بولیں گے نہ ہم بولیں گے

تیرا اندازِ رفو بولے گا

اب نہ بولے گا کوئی آج کے بعد

خجرِ زیبِ گلو بولے گا

ایسا لگتا ہے کہ کچھ دیر میں اب

اس بھرے شہر میں ہو بولے گا

راہ جو تیرے گھر کو جاتی ہے  
تیرے گھر سے کدھر کو جاتی ہے

آبنائے خیال میں جیسے  
کوئی کشتی سفر کو جاتی ہے

دیکھ کردار کے تسلسل میں  
یہ کہانی کدھر کو جاتی ہے

جانے والے کدھر کو جاتے ہیں  
رہ گزر رہ گزر کو جاتی ہے

لوگ اپنی خبر کو جاتے ہیں  
موت اپنی خبر کو جاتی ہے

آ، کہ جاتی ہے یہ جوانی بھی  
اور پھر عمر بھر کو جاتی ہے

تیری آہٹ سنائی دیتی ہے  
پھر نہ جانے کدھر کو جاتی ہے

وہ خدا کو خدا ہی کہتا ہے  
یہ بھی عظمت بشر کو جاتی ہے

ہیں سربستہ اگرچہ راز میرے  
ستارے ہیں مگر غماز میرے

الگ ہیں سوچ کے انداز میرے  
الگ ہیں گیت میرے، ساز میرے

مری گم گشتگی میرا پتا ہے  
مری ایجاد ہیں اعزاز میرے

دم پرواز دم بھرتے ہیں میرا  
حریفِ شعلہ آواز میرے

کیا لکھوں، ہے باعثِ تحریر کیا  
خواب کیا اور خواب کی تعبیر کیا

اک جہاں آباد ہے زیرِ زمیں  
ہے ظلمِ حسرتِ تعمیر کیا

عشق ہے پابستہ زنجیر کیوں  
زلف سے ہے رشتہ زنجیر کیا

دیکھ لیتے آپ کی تصویر کو  
کھینچ لیتے آپ کی تصویر کیا

اک یہی کشتِ زمینِ شعر ہے  
اور ہماری میر کی جاگیر کیا

پڑھ رہا ہوں کتاب آنکھوں میں  
لکھ رہا ہوں شراب آنکھوں میں

آج سمجھے حجاب کے معنی  
آج دیکھا حجاب آنکھوں میں

آج دل کی کتاب کا اُس نے  
پڑھ لیا انتساب آنکھوں میں

کر رہی تھی زمیں قدم بوسی  
کھل رہے تھے گلاب آنکھوں میں



اور پھر ہم نے رت جگے دیکھے  
ایک دن خواب خواب آنکھوں میں

اور پھر خود کو ڈوبتے دیکھا  
اُن سمندر سراب آنکھوں میں

کوئی خانہ خراب ہی ہوگا  
ایسی خانہ خراب آنکھوں میں

آج بے باق کر دیا سارا  
دوستوں نے حساب آنکھوں میں

تیرے بھیجے ہوئے نہ بھیجے ہوئے  
درج ہیں سب عذاب آنکھوں میں

اس سے پہلے کہ گھر نظر آئے  
وہ کسی موڑ پر نظر آئے

یاد ہوں تو کوئی حوالہ دوں  
خواب تو عمر بھر نظر آئے

کوئی چہرہ نظر نہیں آیا  
آئینے در بدر نظر آئے

میں نہ جانے کہاں بھٹک جاؤں  
تو نہ جانے کدھر نظر آئے

راہ میں دو چراغ رکھے ہوئے  
اُس کو ہر موڑ پر نظر آئے

آج چلتے رہیں یونہی دونوں  
جب تلک رہ گزر نظر آئے

ان فلک بوس منزلوں کے بیچ  
صرف دیوار و در نظر آئے

اُس نے تقسیم کر دیا سب کچھ  
اور پھر بھی رہا خدا سب کچھ

چھوڑ آئے ہیں شہر میں تیرے  
اک تری یاد کے سوا سب کچھ

تیرے اپنے سوا ترے گھر میں  
ہے خدا کا دیا ہوا سب کچھ

کام لے ان لبوں سے اب کچھ اور  
صرف ہوتی نہیں دُعا سب کچھ

گھونسلے کے قریب اک چڑیا  
ہوچ میں ہے، یہ کیا ہوا سب کچھ

جسم و جاں کے بھی کچھ تقاضے ہیں  
عشق تنہا نہیں رسا سب کچھ

کیسا ہیجان ہے سمندر میں  
چاند مہمان ہے مرے گھر میں

رقص کرنے لگی ہے ٹائپ پر  
تیرے قدموں کی چاپ دفتر میں

لکھنے والے ہوا کا پس منظر  
پڑ گئے کس ہوا کے چکر میں

آج پہچانتا نہیں کوئی  
میری آواز سے مرے گھر میں

میں ہوا کی طرح اکیلا ہوں  
وقت کے اس کھلے سمندر میں

چوٹیوں کے عذاب لکھے ہیں  
دامنِ کوہ کے مقدر میں

چاند دیکھوں کہ سمندر دیکھوں  
یا ترے دل میں اتر کر دیکھوں

چاندنی رات کا منظر دیکھوں  
یا سکوت لب ساغر دیکھوں

روز یادوں کے صنم خانے میں  
کون رکھ جاتا ہے پتھر دیکھوں

کون آتا ہے یہاں رات گئے  
آج دیوار گرا کر دیکھوں

اپنی قسمت کا ستارہ دیکھا  
اب ستارے کا مقدر دیکھوں

اب جو دیکھوں تو کبھی عالم ذات  
عرصہ ذات سے باہر دیکھوں



ہر چیز سے ماورا خدا ہے  
دنیا کا عجیب سلسلہ ہے

کیا آئے نظر کہ راستوں میں  
صدیوں کا غبار اُڑ رہا ہے

جتنی کہ قریب تر ہے دنیا  
اتنا ہی طویل فاصلہ ہے

الفاظ میں بند ہیں معانی  
عنوانِ کتابِ دل کھلا ہے

کانٹوں میں گلاب کھل رہے ہیں  
ذہنوں میں الاؤ جَل رہا ہے

اپنی یادوں کے آسمان تلے  
سائے ملنے لگے زمیں سے گلے

گھر میں دھونی رمائے بیٹھا ہوں  
اپنے چہرے پہ اپنی خاک ملے

کوئی موسم نہیں محبت کا  
چاند ابھرے کہ آفتاب ڈھلے

دیکھتا ہے ہزار آنکھوں سے  
آسمان کیا ردائے شب کے تلے

جانے کیوں ساحلِ سمندر پر  
بجھنے لگتا ہے دل چراغِ جلے

لے اڑی پھر کسی خیال کی رو  
گھر میں بیٹھے ہوئے تھے اچھے بھلے

چارہ کار مجز قبول نہیں  
ایسے الزام آپڑے ہیں گلے  
لوگ ان پھوس کے مکانوں میں  
چاہتے ہیں کوئی الاؤ جِلے

تیری آہٹ رگِ جاں سے آئی  
روشنی سی یہ کہاں سے آئی

ایسا لگتا ہے سپاہِ مرگاں  
پھر کسی قریہِ جاں سے آئی

زندگی تیری روایت ہم تک  
نغمہ آبِ رواں سے آئی

گھر کا مفہوم کہاں سے آیا  
گھر میں دیوار کہاں سے آئی

بازی جاں بساط پر ہے یہاں  
آج نقشہ ہی کچھ دگر ہے یہاں

چال اُس کی جسے بھائی دے  
کھیل موقوف چال پر ہے یہاں

خوب بازارِ قصہ خوانی ہے  
سب کو درپیش اک سفر ہے یہاں

راستے کس لیے اُبھتے ہیں  
کون سا میرا اپنا گھر ہے یہاں

کیسے زندہ ہیں اس گلی کے لوگ  
راہ چلنا بھی اک ہنر ہے یہاں

چار دیواری عناصر میں  
لوگ کہتے ہیں اک شجر ہے یہاں

ایسا لگتا ہے آئینہ کوئی  
درمیانِ دل و نظر ہے یہاں



پاس اپنے اک جان ہے سائیں  
باقی یہ دیوان ہے سائیں

جس کا کوئی مول نہ گاہک  
کیسی یہ دوکان ہے سائیں

آنسو اور پلک تک آئے  
آنسو آگنی بان ہے سائیں

جوگی سے اور جگ کی باتیں  
جوگی کا اپمان ہے سائیں

میں جھوٹا تو دُنیا جھوٹی  
میرا یہ ایمان ہے سائیں

جیسا ہوں جس حال میں ہوں میں  
اللہ کا احسان ہے سائیں



پھر آج سوئے راہِ بُناں دیکھتے چلو  
شاید کہ ہو کوئی نگراں، دیکھتے چلو

شانوں پہ اپنے زلف پریشاں کیے ہوئے  
مل جائے وہ نہ جانے کہاں دیکھتے چلو

گزر و چمن سے صورتِ آوارہ چمن  
کتنے ہیں تم سے شعلہ بجاں دیکھتے چلو

ہوتا رتار دیکھئے کب تک ردائے شب  
عریاں ہو بنتِ صبح کہاں دیکھتے چلو

سنتے ہیں شہرِ حُسن میں بے دام ان دنوں  
بکتی ہے دل سی جنسِ گراں، دیکھتے چلو

پھر اس کے بعدرات کے سائے ہیں بکراں  
کچھ دیر کا ہے یہ بھی سماں، دیکھتے چلو

نا آشنائے درد کہ دنیا کہیں جے  
ہے کارِ گاہِ شیشہ گراں، دیکھتے چلو

شہر پیاسا دکھائی دیتا ہے  
شورِ دریا سنائی دیتا ہے  
دشت میں تھے تو دشت تھا بیزار  
آگئے تو دہائی دیتا ہے

سامنے ہے نوشتہ دیوار  
دل تجھے کیا بھائی دیتا ہے

آسماں ہو کہ میری حدِ نظر  
کچھ تو ہے جو دکھائی دیتا ہے

اس کا بندہ ہوں میں جو بے مانگے  
پتھروں کو خدائی دیتا ہے

یار ہم تیری خیر مانگتے ہیں  
تو ہمیں جگ ہنسائی دیتا ہے

کوئی ویران گھر رسا اتنا  
صاف ستھرا دکھائی دیتا ہے

کچھ خانماں برباد تو سائے میں کھڑے ہیں  
 اس دور کے انسان سے یہ پیڑ بڑے ہیں  
 پتھر ہیں تو رستے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے  
 رہو ہیں تو کیوں صورت دیوار کھڑے ہیں  
 چیونٹی کی طرح رینگتے لمحوں کو نہ دیکھو  
 اے ہم سفر! رات ہے اور کوس کڑے ہیں  
 میں بچ مداں، بچ خن، بچ عبارت  
 کہتا ہوں تو کہتے ہیں کہ الفاظ بڑے ہیں  
 تاریخ بتائے گی کہ ہم اہل قلم ہی  
 آزادیٰ انساں کے لیے جنگ لڑے ہیں

مہکے گی کہیں زلف تو دھڑکے گا کہیں دل  
آوارگی شوق کے سماں ہی رہیں گے  
یہ بات الگ ہے کہ دبے پاؤں گزر جائیں  
لمحات مگر سلسلہ جنباں ہی رہیں گے  
محسوس ہوا یہ کہ اب اس صحنِ چمن میں  
جو پھول کھلیں گے وہ پریشاں ہی رہیں گے  
اُگتا ہی رہے گا در و دیوار سے سبزہ  
آثارِ جنوں گھر سے نمایاں ہی رہیں گے  
آ جا کہ یہ کم فرصتی شوق بہت ہے  
کچھ اور نہیں وعدہ و پیاں ہی رہیں گے



عکسِ زلفِ رواں نہیں جاتا  
دل سے غم کا دھواں نہیں جاتا

چاندنی کے حسین چہرے سے  
داغ بے خانماں نہیں جاتا

مژدہ نو بہار سنتے ہیں  
خونِ دل رایگاں نہیں جاتا

سُن اے منت کشِ صدائے جرس  
اس طرف کارواں نہیں جاتا

موتیوں سا وہ آبِ آبِ بدن  
وصل کا وہ سماں نہیں جاتا

کوئی موضوعِ گفتگو ہو رسا  
اپنا حُسنِ بیاں نہیں جاتا



یاد آئے بھی تو اب وہ لب و رخسار کہاں  
 ہم کہاں، عشق کہاں وقت کی رفتار کہاں  
 کیا کہیں پاسِ غریب الوطنی ہے ورنہ  
 سایہ زلف کہاں سایہ دیوار کہاں  
 یہ جو تصویر سی آئینہ الفاظ میں ہے  
 تیری صورت ہے مگر صورتِ اظہار کہاں  
 اک عذابِ دل و جاں ہے مری غم خواری بھی  
 جانتے ہیں مجھے لیکن مرے غم خوار کہاں  
 یہ سرابِ غم ہستی ہے کہ صحرائے خیال  
 ہم نکل آئے فسونِ نگہ یار کہاں  
 مجھ کو غالب نہ کہو، میں نہیں غالب لیکن  
 وہ سخن فہم کہاں ہیں وہ طرف دار کہاں

جو گھٹا اُمنڈ کے آئی ہے وہ برس نہ لے تو یہ کیا کھلے  
کہ زمینِ دل کی بھڑاس ابھی ہے دبی ہوئی کہ نکل گئی

جسے دیکھئے وہ تہی سبوسر بزم ہے یہی گفتگو  
جو شراب ہم نے کشید کی وہ کدھر گئی کہاں ڈھل گئی

میں قلیل تیغِ جفا ہوا چلو قرضِ جاں ہی ادا ہوا  
کہو یہ مگر تمہیں کیا ہوا جو یہ رسمِ شہر میں چل گئی

میں غریب شہرِ غزل مجھے یہی سوچ ہے، یہی فکر ہے  
مری سوچ کیا، مری فکر کیا اگر آبروئے غزل گئی

اے دلِ نغمہ سرا  
کوئی ہنگامہ اٹھا

دن ڈھلا شام ہوئی  
کوئی آنسو نہ دیا

یہ سلگتا ہوا دل  
اور یہ سرد ہوا

جانے کس سوچ میں ہوں  
جانے کیا بھول گیا

دستِ گلچیں میں کلی  
پابہ زنجیر صبا

پھول سے جسم پہ، اور  
اس قدر تنگ قبا

آپ تو بھول گئے  
ہم سے یہ بھی نہ ہوا  
رات تھی بیت گئی  
چاند تھا ڈوب گیا

کچھ اور بیٹھتے کچھ اور جی بہل جاتا  
بس اتنی دیر ذرا چاند اور ڈھل جاتا

لگایا ہے یہ کیا روگ اُن نگاہوں نے  
میں راہ رو تھا مرا کیا، کہیں نکل جاتا

لرز رہا ہے اُفق پر جو اک ستارہ سا  
یہی جبیں پہ کسی کے اگر مچل جاتا

سحر کے غم میں جو آنسو بہائے ہیں ہم نے  
ان آنسوؤں سے تو اک آفتاب ڈھل جاتا

رات کچھ آج شبنمی سی ہے  
مسند گل بھی ہوئی سی ہے

آرزو کے حسین خوابوں کی  
چاندنی بھی لٹی ہوئی سی ہے

اُس کی پلکوں پہ کہکشاں کی لکیر  
دُور تک ایک روشنی سی ہے

آپ نے دل کی دھڑکنوں کو سنا  
ان میں کچھ راگ راگنی سی ہے



رقص کرتی ہوئی تہہ گرداب

ایک یادوں کی جَل پری سی ہے

راہ رو بھی ہیں نیند کے ماتے

راہ بھی کچھ تھکی تھکی سی ہے

ہے نشاطِ بدن کہ رگ رگ میں

ایک موجِ سپردگی سی ہے

ان دہکتے ہوئے پیالوں میں

جانے کیا چیز چاندنی سی ہے

پھر سرِ راہ انتظارِ رسا

کوئی آہٹ دبی دبی سی ہے

وہ جو زنداں کو گلستاں کر چلے  
سرزنش کرنے اُنھیں پتھر چلے

ہم بھی اب کس مقتلِ احساس میں  
فکرِ موضوعِ غزل لے کر چلے

کاہشِ عرضِ ہنر ہے اور ہم  
دوستوں سے کیا کہیں کیوں مر چلے

میکدے میں ہم خن کوئی تو ہو  
گفتگو کچھ تو پئے ساغر چلے

ہم تہی دامن گلوں سے کیا کہیں  
کس طرح ہم ان کے دامن بھر چلے

اس تکلف سے آج دل دھڑکا  
جیسے شرما کے کوئی پھول کھلا

گھنی پلکوں کے نرم سائے میں  
نیند ہی نیند ہے نشہ ہی نشہ

یہ تصور میں کون آیا ہے!  
ہمہ شادابی و ہمہ نغمہ

مہکے مہکے سے عارضوں کے کنول  
بہکی بہکی سی چاندنی کی فضا

کوئی امکانِ بازگشت نہیں  
ایسی کھوئی ہے زندگی کی صدا

ہم بھی اُن منزلوں کے جو یا ہیں  
جن کا کوئی نشان ہے نہ پتا

ذکرِ فردوس ہے کہ اے واعظ  
داستانِ طلسمِ ہوش رُبا

ہم نے تو اس عشق میں یارو کھینچے ہیں آزار بہت  
 تم کچھ اس کی بات کرو، ہے جس سے تم کو پیار بہت  
 لوگ ہم ایسے نادانوں کو آئیں گے سمجھانے بھی  
 تیرا غم پھر تیرا غم ہے غم ہے تو غم خوار بہت  
 آئے موسمِ گل، دیکھیں وہ کس کس کو زنجیر کریں  
 اب کے سنا ہے اہل چمن بھی بیٹھے ہیں بیزار بہت  
 ان کو بے حس جان نہ ساقی اولِ شب ہے بادہ نوش  
 رات ڈھلے محسوس کریں گے شیشے کی جھنکار بہت  
 اپنا اپنا حُسنِ نظر ہے اپنی اپنی منزل ہے  
 شرط میسر آنا ہے تو سایہ زلفِ یار بہت



بہت دنوں سے کوئی حادثہ نہیں گزرا  
کہیں زمانے کو ہم یاد پھر نہ آجائیں

جگر کے زخموں کو غنچوں سے کیوں کریں تعبیر  
خزاں نصیب بہاروں کے گیت کیوں گائیں

کوئی تو پوچھنے والا بھی آ ہی نکلے گا  
چلو کہ شہر کی گلیوں سے سر کو ٹکرائیں

یہ جام اور یہ بھرپور چاندنی کا شباب  
بس آج آپ مرے راستے سے ہٹ جائیں

بہت سی باتوں کا خود بھی یقین نہ آئے ہمیں  
جو آج گزرے ہوئے واقعات دُہرائیں

جنہیں خود اپنے غموں سے نہیں مفر وہ رسا  
کہاں سے چاند ستاروں کا درد اپنائیں



تیشہ آہ دل شکن بھی نہیں  
شہرِ خواباں میں قدرِ فن بھی نہیں  
لٹ رہی ہے متاعِ صبر و سکون  
راہ میں کون راہزن بھی نہیں  
اب کے حُسنِ رنگ و یو کہیے  
چاندنی گردِ پیرہن بھی نہیں  
میکدہ ہے کہ آفتابِ بکف  
میرے ساغر میں اک کرن بھی نہیں  
میری مشاطگیِ فن کے لیے!  
تیری زلفوں میں اک شکن بھی نہیں  
میں ہوں وہ شمعِ انجمن کہ رسا  
زینتِ طاقِ انجمن بھی نہیں

حُسنِ بزمِ مثال میں کیا ہے  
آئینے کے خیال میں کیا ہے  
دیکھتی کیا ہے اے نگاہِ کرم  
میرے دستِ سوال میں کیا ہے  
تو نہیں ہے تو کون ہے مجھ میں  
فرقِ ہجر و وصال میں کیا ہے  
انقلاباتِ زندگی کیا ہیں  
گردشِ ماہ و سال میں کیا ہے  
آپ دامنِ کشاں گزرتے ہیں  
رہ گزارِ خیال میں کیا ہے  
باتِ اظہارِ حال میں کیا تھی  
رازِ اخفائے حال میں کیا ہے

خود سے حسنِ خود نگرنا آشنا  
اور دیوانوں سے دنیا آشنا

لفظ تو اک صورتِ اظہار ہے  
آشنا کیا اور کیا نا آشنا

کیا ہوئی اے ساکنانِ شہرِ دل  
وہ صدائے دردِ صحرا آشنا

یاد ہے کچھ سایہِ دیوارِ دوست  
کوئی ایسا شخص بھی تھا آشنا

ہر نفس ہے ماتمِ تعبیرِ خواب  
زندگی ہے خوابِ فردا آشنا

ایک آنسو بھی سرِ مژگاں نہیں  
بول اے دیوارِ دریا آشنا

دل کہ تھا درد آشنا تنہا  
جل بجھا اک چراغ تھا تنہا

تجھ سے کیا کیا ہمیں اُمیدیں تھیں  
تو بھی آئی ہے کیا صبا تنہا

ایسے ہنگامہ تصور میں  
ہم سے ملتے بھی آپ کیا تنہا

رات کی بیکراں خموشی میں  
گیت بنتی رہی ہوا تنہا

یہ تو اپنا شعار ہے ورنہ  
کون کرتا ہے یوں وفا تنہا

دشتِ سادشتِ زندگی ہے رسا  
پھر رہا ہوں غبارِ سا تنہا

زلف سے کابکشاں تک پہنچے  
 سلسلے غم کے کہاں تک پہنچے  
 دل دھڑکتا ہے سرِ راہ خیال  
 اب یہ آواز جہاں تک پہنچے  
 لے کے زلفوں کی اچھوتی خوشبو  
 کوئی جھوٹکا ہی یہاں تک پہنچے  
 دشت و گلشن کی کوئی قید نہیں  
 موجہ گل ہے جہاں تک پہنچے  
 ہائے وہ نغمہ سراپاں چمن  
 رفتہ رفتہ جو فغاں تک پہنچے  
 آئینہ ہو تو انھیں دکھلاؤں  
 دل کے جذبات کہاں تک پہنچے  
 کیوں نہ محسوس کریں اہل نظر  
 بات کیوں دل کی زباں تک پہنچے



چھاؤں میں گیسوؤں کی مہکے تھے  
داغ دل کے رہے کنول برسوں

زندگی صرف ایک پل ہے مگر  
خوں رلاتا ہے ایک پل برسوں

فیصلے وقت کے اٹل ہی سہی  
کیا رہیں گے یونہی اٹل برسوں

جاں گدازی عشق ہے آخر  
اب جلی ہے تو شمع جل برسوں

ہم خراباتیوں سے پھر ملنا  
اس خرابے کی راہ چل برسوں

نیند سی نیند تھی اُن آنکھوں میں  
ادھ کھلے سے رہے کنول برسوں

زلف کو کہکشاں کیا ہم نے  
 کارِ شیشہ گراں کیا ہم نے  
 روشناسِ جہاں کیا ہم نے  
 حسن کو جاوداں کیا ہم نے  
 زندگی بھر رہے ہم آوارہ  
 عشقِ زلفِ رواں کیا ہم نے  
 دو گھڑی کو شباب آیا تھا  
 وہ بھی نذرِ فغاں کیا ہم نے  
 اس کے معنی تو یہ ہیں صبحِ بہار  
 خونِ دل رایگاں کیا ہم نے  
 وہ بھی آزرده خزاں نکلا  
 جس سے ذکرِ خزاں کیا ہم نے

ہر اک درویش کا قصہ الگ ہے  
مگر طرزِ بیاں اپنا الگ ہے  
غنیمت ہے بہم مل بیٹھنا بھی  
اگرچہ وصل کا لمحہ الگ ہے  
ملے تھے کب جو ہم اب پھر ملیں گے  
ہمارا آپ کا رستہ الگ ہے  
عبارت ہے شعورِ زندگی سے  
نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا الگ ہے  
نہیں ہے اور وابستہ ہے سب سے  
ہمارے درد کا رشتہ الگ ہے

ممکن ہے وہ دن آئے کہ دنیا مجھے سمجھے  
لازم نہیں ہر شخص ہی اچھا مجھے سمجھے  
ہے کوئی یہاں شہر میں ایسا کہ جسے میں  
اپنا نہ کہوں اور وہ اپنا مجھے سمجھے  
ہر چند مرے ساتھ رہے اہل بصیرت  
کچھ اہل بصیرت تھے کہ تنہا مجھے سمجھے  
میں آج سرِ آتشِ نمرود کھڑا ہوں  
اب دیکھئے یہ خلقِ خدا کیا مجھے سمجھے

آوارہ میری طرح اگرچہ صبا بھی ہے  
لیکن وہ تیرے جسم کی لمس آشنا بھی ہے  
سازِ شکستِ دل کوئی نغمہ نیا نہیں  
تم نے بہت قریب سے شاید سنا بھی ہے  
سنتا ہوں آپ اپنی ہی آوازِ بازگشت  
یا میرا اس جہاں میں کوئی ہمنوا بھی ہے  
دوشِ نسیمِ صبح پہ پھر دیکھئے کب آئے  
وہ ایک موجِ زلف کہ نغمہ سرا بھی ہے



ہنگامہ ہائے گرمی بازار لے چلے  
 تہمت سی شے اٹھا کے خریدار لے چلے  
 یہ بھی خیالِ خاطرِ احباب ہے کہ ہم  
 دل میں چھپا کے دھنّہ اغیار لے چلے  
 کیا بستیاں اُجاڑ کے وارفتگانِ شوق  
 صحرا میں حسرتِ درودیوار لے چلے  
 ہر چند ناگزیر ہے لیکن نہ اس قدر  
 جس سمت چاہے وقت کی رفتار لے چلے  
 زلفوں کی نرم چھاؤں میں وہ نیند تھی کہ بس  
 ہم پھر بھی اپنے ذہن کو بیدار لے چلے

بندِ قبائے گل کی صورت کھلے ہوئے ہیں  
ان زخم ہائے دل کو کس نے رفو کیا ہے؟

اُس تک غزل نہ پہنچی اک عمر جس کی خاطر  
ہم نے دل و جگر کو کیا کیا لہو کیا ہے

یوں چھوڑ کر ہمیں اب تنہا بچھا بچھا سا  
کس سمت کا ارادہ اے شمع رُو کیا ہے

تیرے سوا بھی ہم نے اے پیکرِ معانی  
سجدہ کیا ہے لیکن پیشِ سبُو کیا ہے

گل کھلائے فصلِ گل اس بار کیا  
دیکھئے ہو صورتِ گلزار کیا

کیا خبر کب درد کی لے ٹوٹ جائے  
چھیڑ دیں کب سازِ دل کے تار کیا

ہر قدم ہے اک صدائے رفتگاں  
زندگی بھی ہے سبک رفتار کیا

کچھ تو ہے اہلِ قفس کچھ تو کہو  
ہے یہ ہنگامہ پس دیوار کیا

میں اور اس موسم میں اے پروردگار  
شہر میں پیاسا پھروں دیوانہ وار

تو نے بندوں پر اتاری ہے وحی  
ہو سکے تو آج مے خانہ اُتار

پیار ایسا نہ یار ایسا ہے  
کیوں یہ دل بے قرار ایسا ہے

یا اسے دیکھنا پسند نہیں  
یا مرا حال زار ایسا ہے

چھاؤں ایسی نہ دھوپ ہے ایسی  
رنگِ لیل و نہار ایسا ہے

ایک مدت سے اس خرابے میں  
شور، بادِ بہار ایسا ہے

آدمی صاحب الدیار ایسا  
یا غریب الدیار ایسا ہے

ڈھونڈیے اب کہاں دکانِ دل  
شہر میں خلفشار ایسا ہے

شاہراہوں پہ اجنبی چہرے  
گھر میں گرد و غبار ایسا ہے  
میں سمجھتا ہوں وہ نہیں ایسا  
نشہِ اقتدار ایسا ہے

نقش و نگارِ شہرِ دل زار دیکھنے  
تم بھی چلو کہ آئے ہیں اغیار دیکھنے  
تو میری خامشی پہ نہ جا آج بزم میں  
بیٹھے ہیں لوگ جراتِ گفتار دیکھنے  
آئے ہیں ہم بھی نقدِ دل و جاں لیے ہوئے  
یہ اور بات گرمی بازار دیکھنے  
کچھ کم نہیں یہ رشتہٴ رسمِ تکلفات  
وہ آئیں حال پوچھنے، غم خوار دیکھنے



کیسے کیسے خواب دیکھے در بدر کیسے ہوئے  
کیا بتائیں روز و شب اپنے بسر کیسے ہوئے

ان ہواؤں کو ردائے بادباں کیسے ملی  
یہ ستارے آبنائے چشمِ تر کیسے ہوئے

نیند کب آنکھوں میں آئی کب ہوا ایسی چلی  
سائباں کیسے اڑے ویراں نگر کیسے ہوئے

جھٹ پٹے میں شام کے پر چھائیاں کیسے ملیں  
اور پھر آنکھوں سے او جھل بام و در کیسے ہوئے

کیا کہیں وہ زلفِ سرکش کس طرح ہم پر کھلی  
ہم طرف دارِ ہوائے رہ گزر کیسے ہوئے

حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں مگر یہ حادثے  
اک ذرا سی زندگی میں اس قدر کیسے ہوئے

ایک تھی منزل ہماری ایک تھی راہ سفر  
چلتے چلتے تم ادھر اور ہم ادھر کیسے ہوئے  
شعر لکھنا ہی فقط کافی نہیں مرزا رسا  
جانتے ہو شاعر اتنے نامور کیسے ہوئے

چراغِ صبح سے شامِ وطن کی بات کرو  
جو راہ میں ہے ابھی، اُس کرن کی بات کرو

درِ قفس پہ جو آئے صبا تو پھر پہروں  
بٹھا کے سامنے گلِ پیرہن کی بات کرو

جہاں سے ٹوٹ گیا سلسلہ خیالوں کا  
وہاں سے زلفِ شکن در شکن کی بات کرو

جو آتا ہے نظر ویسا ہی کیوں ہو  
کہ ہر محمل نشیں لیلیٰ ہی کیوں ہو  
نہ جائے جو ترے کوچے سے ہو کر  
ہمارے گھر کا وہ رستہ ہی کیوں ہو  
مرے ہاتھوں میں تیرا ہاتھ آئے  
سہارے کے لیے تنکا ہی کیوں ہو  
ملا وہ شخص تو اپنا لگا کیوں  
گیا جو شخص وہ اپنا ہی کیوں ہو  
ہمارے نام سے منسوب کوئی  
ستارہ ڈوبنے والا ہی کیوں ہو

اُٹھلا یہ عشق میں تیرے کہ دریا  
 اگر دریا نہ ہو پیاسا ہی کیوں ہو  
 نہ ہو کیوں رقص میں کوئی گُل تر  
 غبارِ دامنِ صحرا ہی کیوں ہو  
 اندھیرا بھی تو ہو سکتا ہے چھت پر  
 کسی آسب کا سایا ہی کیوں ہو  
 یہ دنیا میں رسا جو ہو رہا ہے  
 وہ سب تقدیر کا لکھا ہی کیوں ہو

پھول ہو کہ پتھر ہو اشک ہو کہ شبنم ہو  
 زندگی کے یہ عنوان ہو چکے رقم یارو  
 جذبہ پرستش پھر جذبہ پرستش ہے  
 ہم تراش ہی لیں گے اک نہ اک صنم یارو

الزام تراشیں تو الزام تراشیں کیا  
احباب سمجھتے ہیں الزام تراشیں کیوں  
کچھ دُور تو چلنے دو، خود لوگ سمجھ لیں گے  
رہبر ہیں کہ رہزن ہیں ہم نام تراشیں کیوں  
تقدیر میں پتھر ہیں پتھر ہیں تو کیوں ان سے  
تقدیر نہ پھوڑیں ہم اصنام تراشیں کیوں  
کیوں نام ترا آئے گم نام نہ مرجائیں  
اشعار سنائیں کیوں ابہام تراشیں کیوں



اب جو دیکھا تو داستان سے دُور  
اُٹھ رہا تھا دھواں چٹان سے دُور  
دیکھنا کیا مکان کی جانب  
اب یہاں بیٹھ کر مکان سے دُور  
جی رہا ہوں تری قلمرو میں  
تیرے دل سے ترے گمان سے دُور  
جانتا ہوں زمین کس کی ہے  
بیٹھ جاتا ہوں سائبان سے دُور  
دل وہ آتش کدہ کہ روشن ہے  
شہر شیراز و شیروان سے دُور  
لڑ رہا ہوں رسا قبیلہ وار  
میر و مرزا کے خاندان سے دُور

یہ جو بادیدہ تر آتا ہے  
 روز یہ شخص کدھر جاتا ہے  
 زندگی خواب نظر آتی ہے  
 خواب کچھ اور نظر آتا ہے  
 کوئی صورت ہو بدل جاتی ہے  
 کوئی نشہ ہو اتر جاتا ہے  
 طور بے طور ہوا چلتی ہے  
 تال بے تال شجر گاتا ہے  
 تو کسی روز ادھر آ کر دیکھ  
 آسمان روز ادھر آتا ہے  
 دل سے آگے کوئی صحرا ہے نہ باغ  
 تو دے پاؤں کدھر جاتا ہے

مرنے والے کا زمیں سے رشتہ  
کتنا شایستہ نظر آتا ہے  
درد کی تیز ہواؤں میں رسا  
دل تو کیا دشت بکھر جاتا ہے

وہ جو کہتے ہیں بیاں ہے اُن کا  
پر یہ انداز کہاں ہے اُن کا  
اب سرِ راہ گماں کوئی نہیں  
ایک سایہ سا رواں ہے اُن کا  
ہائے وہ عیش کے لمحاتِ سبک  
اب تصور بھی گراں ہے اُن کا  
قطرۂ اشک گہر تھے جب تھے  
اب تو احساسِ زیاں ہے اُن کا

خواب اپنے دکھائے کس کو  
جاگئے کیا جگائے کس کو

اس خرابے میں جائے کس پاس  
پاس اپنے بلائے کس کو

بیٹھے کس شجر کے سائے میں  
حال اپنا سنائے کس کو

وہ شب و روز وہ گلی کوچے  
یاد کیا کیا دلائے کس کو

زندگی ہے رفاقتوں کا سفر  
اس سفر میں گنوائے کس کو

منصفی مانگئے یہاں کس سے  
جرم اپنا بتائے کس کو

کس کے رُخ سے اُٹھائیے پردہ  
کس کا چہرہ دکھائیے کس کو

یہ خدا کی زمین ہے صاحب  
اس زمیں سے اُٹھائیے کس کو

جب کوئی پوچھتا نہیں تو رسا  
نام اپنا بتائیے کس کو



ماں کی ہیں دعائیں ساتھ میرے  
ترکے پہ گزارا کر رہا ہوں

لپٹا ہوں یہ کس کی خاکِ پا سے  
تسخیر ستارہ کر رہا ہوں

پیروں سے زمیں نہیں لگی ہے  
ساحل سے کنارہ کر رہا ہوں

پیڑوں سے قبائیں چھن رہی ہیں  
موسم کا نظارہ کر رہا ہوں



رندانِ تہی جام ہیں کچھ اور طرح کے  
 یارانِ مے آشام ہیں کچھ اور طرح کے  
 کیا جانے کافر ہیں کہ مومن ہیں مگر ہم  
 سرگشتہِ اوہام ہیں کچھ اور طرح کے  
 بکتے ہیں نہ جھکتے ہیں نہ رکھتے ہیں عداوت  
 ہم بندہ بے دام ہیں کچھ اور طرح کے  
 اس شہر میں آباد غریب الوطنی ہے  
 غربت کے یہاں نام ہیں کچھ اور طرح کے  
 وہ آنکھِ خن ساز ہے کچھ اور طرح کی  
 اس زلف کے اقدام ہیں کچھ اور طرح کے  
 رودادِ غمِ عشق ہے کچھ اور طرح کی  
 افسانے مگر عام ہیں کچھ اور طرح کے

تعمیرِ دلِ زار ہے کچھ اور طرح کی  
اس گھر کے در و بام ہیں کچھ اور طرح کے  
مصروفِ ہر اک شخص ہے، اس شہر میں لیکن  
کچھ ہیں کہ جنہیں کام ہیں کچھ اور طرح کے  
چلتی ہے رسا عشق میں بس دل کی گواہی  
ہر چند کہ احکام ہیں کچھ اور طرح کے

کرن پھوٹے گی پھر اُس کنجِ لب سے  
کہ روشن صبح کے امکان ہوں گے  
ہمارے شعر دہرائے گی دنیا  
ہم اپنے دور کی پہچان ہوں گے  
کہاں رکتی ہے دریا کی روانی  
جو آنسو تھم گئے طوفان ہوں گے

گل کو پیغمبرِ شب کہتا ہوں

شب سے مفہومِ خزاں ہے میرا

دُور افتادۂ گلشن ہوں میں

ہمنوا برگِ خزاں ہے میرا

اب مرے سامنے ہے شمعِ غزل

اب یہ دورِ گزراں ہے میرا

شعر ہے معجزۂ فکرِ رسا

حُسن اندازِ بیاں ہے میرا

اُس ایک عالم رنگیں کا انتظار نہ پوچھ  
جس انتظار میں عالم ہزار گزرے ہیں

کیا ہے حُسن کا تخلیق اک جہاں ہم نے  
ہم اپنے وقت کے پروردگار گزرے ہیں

سُنا ہے اب کے نسیم بہار کے جھونکے  
مزاجِ اہل گلستاں پہ بار گزرے ہیں

ہجومِ گردشِ لیل و نہار کی سو گند  
ترے بغیر بھی لیل و نہار گزرے ہیں

سب تعلق کے استعارے ہیں  
دوست دشمن سبھی ہمارے ہیں

ہم پہ کیا آسماں برستا ہے  
ہم تو یونہی زمیں کے مارے ہیں

کیا بتائیں کہ یہ دیے ہم نے  
کن در و بام سے اُتارے ہیں

میں پریشان ہوں تو اُس نے بھی  
بال اپنے کہاں سنوارے ہیں

چاندنی ہے کہ گردِ تنہائی  
یہ دُھواں ہے کہ اُبر پارے ہیں

اب یہی جمع و خرچ ہے اپنا  
اب یہی روز و شب ہمارے ہیں

اب نہ وہ پتھر و تاب دریا ہے  
اب نہ وہ مہرباں کنارے ہیں



جانتے ہو زمین کس کی ہے  
پاؤں کیا سوچ کر پیارے ہیں  
یاد رکھو کسی حوالے سے  
ہر حوالے سے ہم تمہارے ہیں  
دل کبھی درد کا ادارہ تھا  
آج ایسے کہاں ادارے ہیں  
اور کچھ دن گزار لیں گے رسا  
جب یہاں اتنے دن گزارے ہیں

کچھ تو ہے انھیں ہجر کی راتوں سے تعلق  
کچھ تو تری زلفوں کے بکھرنے کا سبب ہے  
پابستگی رسم و رہ عشق ہے ورنہ  
مقصد مرا آوارگی پہلے تھا نہ اب ہے

دیکھتی ہے رات بستر کی طرف  
دیکھئے کیا خاک باہر کی طرف  
باغ سارا شاخ گُل کا ہمنوا  
خشک پتے باز صرصر کی طرف  
جھیل کی آغوش میں پرچھائیاں  
لڑکیوں کا دھیان گاگر کی طرف  
دل سے کیوں جاتا نہیں گھر کا خیال  
کیوں قدم اٹھتے نہیں گھر کی طرف

چھوڑ کر تنہا نکل جاتا ہے دن  
جانے کس تاریک منظر کی طرف

ٹوٹا رہتا ہوں شیشے کی طرح  
دیکھتا رہتا ہوں پتھر کی طرف

کوئی رُت ہو طائرانِ حرفِ دل  
اُڑ کے آتے ہیں سخنور کی طرف

چل پڑے تو اب رسا کیا دیکھنا  
زندگی کے لا و لشکر کی طرف

آدمی کو بہت تلاش کیا  
آدمی کی سرشت میں ہم نے

دیے جلائے تھے ہم نے وفا کے رستے میں  
نہ جانے آگئے کیسے ہوا کے رستے میں

میں آج بھی وہیں بیٹھا ہوں نقشِ پا کی طرح  
جہاں گیا تھا مجھے وہ دٹھا کے رستے میں

پھر اس کے بعد نہ طوفانِ گرد و باد آیا  
نہ کوئی بادیہ پیا ہوا کے رستے میں

کچھ اپنے واسطے اچھا نہیں کیا تم نے  
ہمارے واسطے کانٹے بچھا کے رستے میں

یہی نشان ہے میرا کہ چھوڑ آیا ہوں  
میں اپنے نام کا کتبہ لگا کے رستے میں



پیالہ ہو تو اُچھالوں شراب ہو تو پیوں  
حیات ہو تو لُٹاؤں قضا کے رستے میں

یہ زندگی گزراں ہے گزر ہی جائے گی  
ادھر ادھر کے فسانے سنا کے رستے میں

ہوا کدھر کی چلے یہ ہوا کی مرضی ہے  
ہزار بیٹھے آ کر ہوا کے رستے میں

یہ اور بات اُجالا نہ کر سکے لیکن  
چراغ چھوڑ چلے ہم جلا کے رستے میں

عجب نہیں جو کبھی پھر کسی بہانے آئے  
ابھی گیا ہے جو آنکھیں دکھا کے رستے میں

نہ جانے شور مچاتی یہ نامراد ہوا  
کہاں سے آگئی آوازِ پا کے رستے میں

کوئی تو ہو جو نبرد آزما ہو رستوں سے  
کوئی تو ہو جو چلے سر اٹھا کے رستے میں



سوال کرنا ہی ٹھیرا تو کیوں نہ جا بیٹھوں  
کہیں فقیر کی صورت بنا کے رستے میں

ہزار ہا شجر سایہ دار تھے لیکن  
کسی نے بات نہ پوچھی بٹھا کے رستے میں

تمہارے خواب الگ ہیں تمہیں رسا مرزا  
ملے گا کیا یہاں آنکھیں بچھا کے رستے میں  
اپنے دوست جالب کے لیے جالب کی زمین میں

کون دل کی زباں سمجھتا ہے  
دل مگر یہ کہاں سمجھتا ہے

بات بھی تول رہا ہے پیارے  
یا یونہی بول رہا ہے پیارے

شہر میں ڈھونڈ پڑی ہے تیری  
تو یہاں ڈول رہا ہے پیارے

جب سے کنگال ہوا ہے یہ دل  
سپیاں رول رہا ہے پیارے

وہ کوئی اور نہیں ہو سکتا  
مجھ میں جو بول رہا ہے پیارے

اپنے لہجے میں انا کا اپنی  
زہر کیوں گھول رہا ہے پیارے

شل ہوئے پاؤں تو اب داروغہ  
بیڑیاں کھول رہا ہے پیارے  
دھوپ رخصت ہوئی دیواروں سے  
سایا پرتول رہا ہے پیارے  
دل بھی خالی کبھی اتنا نہ رہا  
جتنا کشلول رہا ہے پیارے  
جب بھی پہنی ہے قبائے دنیا  
کچھ نہ کچھ جھول رہا ہے پیارے  
حال تو صاحب احوال سے تھا  
اب تو یہ خول رہا ہے پیارے  
ہم رسا جھول رہے ہیں جھولا  
یا فلک ڈول رہا ہے پیارے

جانتا کوئی نہیں تقدیر کیا ہے کیا نہیں  
اس ورق کے اُس طرف تحریر کیا ہے کیا نہیں

قصرِ دل ڈھایا ہے جس نے یہ اسی سے پوچھیے  
اس میں مضمحل صورتِ تعمیر کیا ہے کیا نہیں

زندگی ہوتی ہے کیا عمرِ رواں کیا چیز ہے  
وقت کیا ہے وقت کی تعبیر کیا ہے کیا نہیں

شہر کی گنجان سڑکوں پر بگولوں کی طرح  
موت کا یہ رقص بے زنجیر کیا ہے کیا نہیں

آپ کا ہر فیصلہ میرے لیے اعزاز ہے  
اس کو جانے دیجیے تفسیر کیا ہے کیا نہیں

اس کہانی میں نہ جانے کیا مرا کردار ہے  
اور کس کردار کی تفسیر کیا ہے کیا نہیں

کیا بتاؤں کون اس دل کے نہاں خانے میں ہے  
کیا کہوں وہ پیکرِ تصویر کیا ہے کیا نہیں

اک اسیرِ زُلف سے کیا پوچھتے ہو ناصحو  
زُلف کیا ہے کیا نہیں زنجیر کیا ہے کیا نہیں

آپ کیا جانیں کہ زخمِ بے دلی ہوتا ہے کیا  
اور پاسِ خاطرِ دل گیر کیا ہے کیا نہیں



بے خیالی کو خیال یار باندھ  
دشت کو ہم معنی گلزار باندھ

پھر مری آنکھوں سے اپنے خواب دیکھ  
دل سے پیمانِ وفا اک بار باندھ

آئینے کے اور کچھ اسرار کھول  
زُلف کو کچھ اور پُر اسرار باندھ

یا غبارِ راہ کو سر پہ دٹھا  
یا حصارِ سایۂ اشجار باندھ

یا ہوائے شوق کو مہمیز کر

یا سمندِ عمر کی رفتار باندھ

یا تو بارِ منت دریاں اٹھا

یا کوئی طرہ سرِ دستار باندھ

اس عجائب خانہ دل میں کوئی

اک الگ گوشہ پئے دل دار باندھ

اب کوئی بھی خواب کا عالم کھلے

رنگ اپنا دیدہ بیدار باندھ

گنگنائے خود رسا جن کو ردیف

قافیے ایسے کوئی دوچار باندھ

سر اٹھایا تو سر رہے گا کیا  
خوف یہ عمر بھر رہے گا کیا  
اس نے زنجیر کر کے رکھا ہے  
ہم سے وہ بے خبر رہے گا کیا  
پاؤں رہتے نہیں زمیں پہ ترے  
ہاتھ دستار پر رہے گا کیا  
وہ جواک خواب ہم نے دیکھا تھا  
خواب ہی عمر بھر رہے گا کیا  
مر رہے ہیں فراق میں تیرے  
تو ہمیں مار کر رہے گا کیا  
عشق خانہ خراب تیرے بعد  
کوئی آباد گھر رہے گا کیا  
ہم نہ ہوں گے تو یہ جہانِ طلسم  
یہ فریبِ نظر رہے گا کیا

تیرا اپنا نہیں ترا سایا  
تیرے زیر اثر رہے گا کیا

موج اپنی جگہ کنارہ ہے  
یہ کنارہ مگر رہے گا کیا

ڈوبنا تھا جسے وہ ڈوب گیا  
تو بھی اب ڈوب کر رہے گا کیا

آج کیا بے افق رہے گی شام  
بے ستارہ سفر رہے گا کیا

دیکھ کر ان پری نژادوں کو  
آئینہ خود نگر رہے گا کیا

اپنے بس میں رہے گی کیا آندھی  
اپنے بل پر شجر رہے گا کیا

شہر میں وہ جدھر رہے گا رسا  
شہر سارا ادھر رہے گا کیا

دريا شايد زوروں پر ہے  
پانی چھت کی کوروں پر ہے  
قطرہ قطرہ خونِ دل کا  
اب تک اس کے پوروں پر ہے  
ایسی نخوت ایسا غرہ  
آخر کن شہ زوروں پر ہے  
خاموشی کی ایک دھڑی سی  
ان ہونٹوں کی کوروں پر ہے



اِس جیون کا تانا بانا  
اُن آنکھوں کے ڈوروں پر ہے  
بازاروں کی گہما گہمی  
ان کھیتوں ان ڈھوروں پر ہے  
رقص کریں یا ہجرت اب کے  
یہ جنگل کے موروں پر ہے  
زور یہاں ہر زور آور کا  
اپنے سے کمزوروں پر ہے  
دنیا بھر کی ذمے داری  
جیسے رسا بس گوروں پر ہے

تمام رشتہ عیب و ہنر سے لکھے ہیں  
 یہ میرے حرف یہ میرے گواہ سچے ہیں  
 زمیں کو میری گواہی میں کون لایا ہے  
 زمیں کے ہاتھ پہ کس نے چراغ رکھے ہیں  
 یہ کون زخاں ہوا پر سوار آیا ہے  
 پس غبار یہ کیا آئینے سے رکھے ہیں  
 یہ روز کس کے تعاقب میں گھر سے جاتا ہوں  
 یہ روزِ منت نئے چہرے کہاں سے آتے ہیں  
 ادا سیوں کا سبب کوئی ہو تو بتلائیں  
 کہ ہم اُداس کبھی بے سبب بھی رہتے ہیں  
 سگانِ شہر سے کوئی گلہ نہیں ہم کو  
 اب ان سے کیا کہیں تیری گلی کے بچے ہیں  
 نہ اب کے رنگ ہی پھوٹے ہیں میرے کھیتوں سے  
 نہ اب کے سَیل ہی مرغابیوں کے آئے ہیں

صبح سے ہے غرض نہ شام سے ہے

وقت کو کام اپنے کام سے ہے

رات کی فکر کیجیے صاحب

کہ اندھیرا تو آج شام سے ہے

ذکر تیرا ترے حوالے سے

بات میری مرے کلام سے ہے

کیا سناؤں میں وہ کہانی ہوں

جس کا آغاز اختتام سے ہے

اب مجھے رات جہاں لے جائے

چاند نکلا تو اُسی بام سے ہے

ساحلِ نامراد کو نسبت

جانے کس موجِ خوش خرام سے ہے

کہو اس عہدِ ناپرساں میں جانی  
غزل خوانی کریں یا زندگانی

بچی ہیں خوشہ چینوں کی دکانیں  
کوئی غالب ہے کوئی میرِ ثانی

کہاں تک فصلِ گریہ کاٹھے گا  
کہاں تک بوئے گا خوش گمانی

میں کیا لایا ہوں دریا بُرد کرنے  
توقف تو کرے دریا کا پانی

گھسلا قطرے پہ کیا احوالِ دریا  
کنارے ہو گئے لفظ و معانی

کہ جیسے نیند اڑ جائے اچانک  
اچانک ختم ہو جائے کہانی

نہ جانے کس ہوا کی منتظر ہے  
سر ساحل یہ کشتی بادبانی

یہ دستک سی جو پیہم ہو رہی ہے  
کوئی ہوگی بلائے ناگہانی

فقط دیوار ہی حائل نہیں ہے  
قصبے اور بھی ہیں خاندانی

نہ آئے تو نہ آئے اس کی مرضی  
اور آجائے تو اس کی مہربانی

میں یوں ہی جاگتا ہوں اور ستارے  
سمجھتے ہیں مجھے قطبِ زمانی

وہ تیری ہمراہی کچھ ساعتوں کی  
یہ میری عمر بھر کی راگدانی



ابھی تو میں پرستش کر رہا ہوں  
خدا ہونے تلک تو ٹھیر جانی

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لہجہ  
بدل دیتا ہے لفظوں کے معانی

یہ آثارِ شکستِ قصرِ دل ہیں  
یہ بستی ہے کہ بستی کی کہانی

مرے بلے تلے شاید دبی ہو  
مرے اسلاف کی کوئی نشانی

عجب تھی چھاؤں اُس بوڑھے شجر کی  
کہاں ہوتے ہیں پیدا ایسے گیانی

خیالِ خاطرِ احبابِ مرزا  
ہمارے ہی لیے لازم ہے یعنی

کبھی سوکھے درختوں کی زبانی  
سنو ان ابرزادوں کی کہانی

دکتی یہ سنہری بالیاں اور  
ڈھلکتی یہ روائے آسمانی

سر ساحل یہ انبوہ غزالاں  
یہ لہروں کا خرام آہوانی

عجب سفاک ہوتی ہیں نگاہیں  
عجب بے باک ہوتی ہے جوانی

سرگلزار کانٹے چن رہی ہے  
ترا کیا مسئلہ ہے بھاگوانی

زمانہ ہے تری پایل کا دشمن  
تری دشمن ہے تیری ساودھانی

بدن کیا ہر گل شاخ بدن سے  
جھلکتی ہے ادائے باغبانی

کہا، وہ خاک مانے گا کسی کا  
کہ جس دل پہ ہو تیری حکمرانی

غنیمت ہے سرِ راہِ محبت  
نظر آتی ہیں کچھ قدریں پرانی

فقیروں کی دعا اپنی جگہ ہے  
شرف اپنی جگہ ہے میزبانی

نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو آنکھیں  
کریں کیا خاک دل کی ترجمانی

سفر کیا اور اسباب سفر کیا  
مکان کیا اور کیا نقل مکانی

دیارِ غیر میں ہوں اور تنہا  
گزارا ہو رہا ہے خیر جانی

وہاں بھوکے کو کیا روٹی ملے گی  
جہاں ملتا نہ ہو پیاسے کو پانی

یہی بستی جو اب ویراں پڑی ہے  
ہوا کرتی تھی دل کی راج دھانی

اسے حیران کردوں گا میں اک دن  
بہت بنتی ہے یہ دنیا سیانی

خدا بخشے عجب ہنگامہ جو تھے  
جنابِ حضرتِ دل آں جہانی

گیا اک بار تو سمجھو گیا دل  
دھری رہ جائے گی سب سرگرانی

کیا بچ تھے اُس زلفِ گرہ گیر کے اندر  
اب تک ہے خلشِ ناخنِ تدبیر کے اندر

کیا رنگ بکھیرے ہیں مصوّر نے کہ آنکھیں  
تصویر ہوئی جاتی ہیں تصویر کے اندر

کیا قلعہ ترے حُسن کا قلعہ تھا مری جاں  
میں آ گیا کس نرغہٗ تسخیر کے اندر

زنجیر کیا اور پھر اُس شوخِ نظر نے  
کیا رقص کیا حلقہٗ زنجیر کے اندر

یہ بارہ دری نذر گزاروں کے لیے کیا  
مختص ہے ترے حُسن کی جاگیر کے اندر



سو بار گیا ہوگا یہ دل تیری گلی میں  
کم بخت اس اک لمحہ تاخیر کے اندر

آنکھوں میں جو آتا ہے وہ آتا ہے نظر کیا  
تحریر کہیں نامہ تقدیر کے اندر

پلکوں پہ ترے خواب سجائے ہوئے کب تک  
بیٹھا رہوں میں حجلہ تعبیر کے اندر

دنیا کے ستائے ہوئے ٹھکرائے ہوئے لوگ  
آتے ہیں یہ کس زمرہ تعزیر کے اندر

وہ مجھ پہ برستا رہا بادل کی طرح اور  
میں بہتا رہا لذتِ تقریر کے اندر

آنکھوں کو بہالے گیا دریائے تجسس  
دل ڈوب گیا ورطہ تحریر کے اندر

جُزِ گردِ سفر اور کوئی بیش بہا چیز  
ہوتی ہے کہیں دامنِ رہ گیر کے اندر  
شاید کبھی آجائے قلندر کوئی ہم سا  
بیعت ہے کہاں سلسلۂ میر کے اندر

ان ستاروں کے اشارے ہیں الگ  
ان اشاروں کی زباں ہے کچھ اور  
صرف لہروں کی اداکاری ہے  
یاتھہ آبِ رواں ہے کچھ اور

چلتے چلتے زمیں تمام ہوئی  
کس خرابے میں آ کے شام ہوئی

# نظمیں

## حمد

مئی پانی آگ ہوا سب تیرے ہیں  
سورج تیرا دھرتی تیری

چھایا تیری مایا تیری  
بادل تیرے بجلی تیری

رنگ برنگی تتلی تیری  
جگنو تیرے خوشبو تیری

گرمی بارش جاڑا تیرا  
تیز سے کا دھارا تیرا

نیلا گنبد زرد کبوتر  
جگمگ تارے سب تیرے ہیں

میری آنکھیں میرا تن من  
میری سانسیں میرا جیون

میرے بچے میرا آگن  
میرے اپنے میرے اپنے  
سب دھوکا ہے سب تیرے ہیں



## دعا

جسم تحلیل ہوئے، روح بیمار ہوئی  
پابہ زنجیر گراں بار ہوئی  
اے خداوندِ جہاں  
میری منزل کا نشان  
آسماں ہے کہ دھواں  
اے مرے ربِّ جلیل  
میں نہ عیسیٰ نہ خلیل  
میرے ہونے کی دلیل  
آگ میں پھول کوئی  
برسرِ ریگِ زباں  
چشمہٴ آبِ رواں  
سلسلہ ہائے خبر  
از سفر تا بہ سفر

جسم سے جسم تلک  
روح سے روح تلک  
ازکراں تا پہ کراں  
اے خداوندِ جہاں  
اے مرے ربِّ جلیل۔ میرے ہونے کی دلیل

## جلا وطن

شاخ سے گل نے اک سوال کیا  
ہم کو قدرت نے بے مثال کیا  
بات کیا تیری دسترس میں نہیں  
کیا مرے شعلہٴ نفس میں نہیں  
ہم گلستاں میں ہیں قفس میں نہیں  
سُن کے گلچیں کا خواب ٹوٹ گیا  
شاخ سے گل کا ہاتھ چھوٹ گیا

## مسافر

دیکھ کر مجھ کو مضمل تنہا  
چند سائے سے آگئے نزدیک

میں نے چاہا کہ اُن سے مانگوں بھیک  
حسرتوں کا ہجوم تھا دل میں  
موجزن تھا سکوتِ رودِ نیل  
آنسوؤں نے جلا دی اک قندیل

رات جتنی اُداس تھی پہلے  
آج اتنی اُداس بھی تو نہیں  
روشنی آس پاس بھی تو نہیں

## خون کی روشنی

اے مرے خون کی روشنی

اور تابندہ ہو اور تابندہ ہو

چہرہ دہر پر

ماہ پر مہر پر

تیرگی کے نشاں صورتِ داغ ہیں

اور ہر قطرہ خونِ دل ایک سیارہ ہے جو کہ

گردش میں ہے

روشنی کے لیے

زندگی کے لیے

آگہی کے لیے

اے مرے خون کی روشنی

اور تابندہ ہو اور تابندہ ہو

## اپنے نواسے مزمل کے لیے

میرے پیروں میں ننھے مٹے پیار کی اک زنجیر پڑی ہے  
گویا اک تصویر کھڑی ہے

گھر سے باہر جاؤں تو محسوس کروں میں  
کہ زنجیر بڑی ہے

گھر میں لوٹ کے آؤں تو محسوس کروں میں  
کہ زنجیر کڑی ہے

مٹے تیرا پیار بڑا ہے

پیار کا ہر اظہار بڑا ہے

اور میں تیرے پیار کے آگے نہ مٹا سا لگتا ہوں  
تیرا منہ تکتا ہوں

دل ہی دل میں کہتا ہوں

میرے مولا پیار کی اس زنجیر کو میرے خوابوں کی تعبیر بنادے

فردا کی تو قیر بنادے

دنیا کی تقدیر بنادے



## ٹکنا لوجی

چاند ہمالہ کی ایک برف بستہ چوٹی پر کھڑا  
سورج کے نکلنے کا منتظر ہے  
اُدھر وہ سورج

سمندروں پر پڑاؤ ڈالے  
شعاعوں کو حکم دے رہا ہے  
کہ ان کے سینوں میں آگ بھردو  
انھیں تپاؤ

اور ہواؤں سے کہہ دو  
کہ جیسے ہی ان کے جسم کا سونا اور چاندی پگھلے  
اور جیسے ہی ان کے سینوں سے بھاپ نکلے  
اُسے اُٹھالے

اور لے جائے اک ایسی سرزمین پر  
جہاں کی مٹی  
خدا کے وعدے کی منتظر ہے  
اور جب میں کل اُدھر سے گزروں تو دیکھوں  
کہ کھیت گنگنا رہے ہیں  
چمنیاں دف بجار ہی ہیں

## پچھتاوا

بس اسٹاپ سے گزرنے والی  
تمام ممکنہ بسیں گزر چکی ہیں  
مگر وہ لڑکی  
کہ جس کے ہاتھ میں اک پڑانا رسالہ ہے  
نئے جوڑے میں ملبوس  
کسی نئے روٹ پر مٹ کے اجرا کے انتظار میں ہے  
جانتی ہے  
کہ بسوں کے پڑانے نمبر بدل چکے ہیں  
راستے بہت آگے نکل چکے ہیں

## منشور

زمین ایک  
زمین کی تمام نعمتوں کے سب امین ایک  
زمین ایک  
یہ لہلہاتی کھیتیاں  
یہ سر بلند چمنیاں  
جفاکشوں کی داستاں  
حسین سے حسین ایک  
زمین ایک  
زمین کی تمام نعمتوں کے سب امین ایک

## غزل

اُف یہ دل کش یہ دل آویز خطوط

یہ تراشا ہوا مرمر سا بدن

اک حسیں پیکرِ تصویر ہے تو

تجھ کو محسوس کیا ہے میں نے

گو سرِ صفحہ قرطاس سہی

پر مرے ذہن کی تخلیق ہے تو

میں کہ خالق ہوں ترا دیکھ مجھے

تجھ پہ لازم ہے پرستش میری

آمری روح کے کاشانے میں

تجھ کو اک زندہ حقیقت کی طرح

جیسا محسوس کیا ہے، دیکھوں

## وقت

قربتوں میں بھی ایک دُوری تھی  
اب تو ہم ہو گئے ہیں اور بھی دُور

کتنا ظالم ہے زندگی کا سفر  
سوچتا ہوں کبھی کبھی تنہا

جانے کس موڑ کس دورا ہے پر  
وقت کی آندھیاں اُٹھ آئیں  
اور ہم سوچتے ہی رہ جائیں

پھر اُس کے بعد خواب کو آنکھیں ترس گئیں  
آیا تھا ایک نیند کا جھونکا ہوا کے ساتھ



## سنہرے خواب

وہ ہمارا بچپن تھا  
جب ہم آسمان پر مٹی اُچھالا کرتے تھے  
یہ ہمارا لڑکپن ہے  
جب ہم اس گملے میں مٹی بچھا رہے ہیں  
ہو سکتا ہے  
کل اس گملے میں سرخ گلاب ہوں  
اور ہماری آنکھوں میں  
سنہرے خواب

## قزاق

یہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے تختے اور بادبان ہیں  
لیکن اُن ستارے کے لیے  
جو سرِ شام دریا میں ڈوب جاتے ہیں

## ماہی گیر

سمندر اپنے جلال سے  
اور ماہی گیر اپنے جال سے  
پہچانا جاتا ہے

ایک خط سے اقتباس

تم نے دیکھا  
کہ یہ ستارے  
ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کے خبط میں  
آج تک معلق ہیں

کھڑکیاں اور ستارے

آسمان یہ بات کیوں نہیں سمجھتا  
کہ ہم  
ایک وقت میں اتنے محاذ نہیں کھول سکتے

سرِ شام

اتنا ضرور ہے کہ ہم ہر روز سورج کی روشنی میں  
ایک تاریک گھر سے  
دوسرے تاریک گھر تک پہنچ جاتے ہیں

## داستان گو

پھر یہ ہوا کہ میں  
برگد کے درخت میں تبدیل ہو گیا

## نا آفریدہ

میں آوازوں میں بٹ گیا ہوں  
ہو سکتا ہے  
ہر آنے والی آواز  
میری ہی آواز ہو

## کیٹلاگ

خدائے ذوالجلال  
آنکھیں بند کیے دیکھ رہا ہے

آئینہ

یہ کیسی روشنی ہے  
جو میرے اور خدا کے درمیان حائل ہے

کتبہ

پرانی قبر پر  
نیا کتبہ نصب نہیں کیا جاسکتا

ایک قبر کے پاس

زلزلے آسکتے ہیں  
لیکن  
دل دھڑکنے کی آواز نہیں آسکتی

قلعے کے اندر

دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں  
تو مجھے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں  
قید خانے کی سلاخیں معلوم ہوتی ہیں

## پس منظر

ہم سوداگر ہیں  
ہمیں یہاں قید کر دیا گیا ہے  
اور سامنے جھیل میں جو عکس ہے  
وہ اس قید خانے کی کنجی ہے

## دعا

اب اگر میرے ہاتھ کاٹ دیے جائیں  
تو انھیں دعا کے لیے اٹھالینا

## اندھا

لیکن میرا مستقبل مجھ پر روشن ہے

## موم بتی اور میں

میں اس کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا  
کہ سامنے دُور تک اندھیرا ہے



## ہیڈ مسٹر لیس

میں بچوں کے سامنے زندگی کا آموختہ دہراتی ہوں  
بچے  
مجھے علم بھی دیتے ہیں اور روٹی بھی

## انتظار

ہمارے پاس  
اپنے باپ کی محنت میں ہاتھ بٹانے کا ایک یہی راستہ ہے  
کہ ہم  
اس روٹی کو آپس میں بانٹ لیں

## معبدوں کے چراغ

معبدوں میں چراغ جلانے والے آگئے ہیں  
اس سے پہلے کہ یہ رات جہنم میں تبدیل ہو  
ہم اپنے اندر سے سچ برآمد کر لیں

جالے سے باہر

سمندر کی لہریں چٹان سے ٹکراتی ہیں  
اور لوٹ جاتی ہیں  
مکڑی اپنے اطراف جال بنتی ہے  
اور خود قید ہو جاتی ہے

نیلیم

یہ میری آنکھوں کے نیلیم ہیں  
ان میں ایک شام کا اور  
ایک صبح کا ستارہ ہے

زینہ

باپ بچے کو چھت پر  
اور بچہ آسمان پر  
چاند کو دیکھ رہا ہے

## مچھلیاں

ہم ماہی گیر کے جال میں ہیں  
اور ماہی گیر  
ایک سنہرے جال میں

## سمندر

میرا کوئی حریف نہیں ہے  
میں اپنے آپ سے جنگ کر رہا ہوں

## میّت کی آواز

میں گھر کی ایسی چوکھٹ ہوں  
جسے دیمک کھا گئی ہے  
میں اب کسی کا خیر مقدم نہیں کر سکتی

## تمثیل

شاید ہم کسی دریا کا خواب ہیں  
اور ہمارے خواب  
کسی نادیدہ دریا کے وجود کی تمثیل

## آخری چراغ

اس بستی کے سارے چراغ ایک جیسے ہیں  
تم اپنے دل کا آتش کدہ بجھنے نہ دینا  
کہ یہ اس مقدس مٹی کا آخری چراغ ہے

## رات

کیا یہ بات ہمارے لیے فخر کی نہیں  
کہ چاند  
ممتاز سفارت کار ہونے کے علاوہ  
ایک خوب صورت شاعر بھی ہے

## ماہی گیر

ماہی گیروں کو یقین ہے  
کہ سورج کی سنہری انگلی کو  
کسی سمندری مچھلی نے نگل لیا ہے

## تراجم

چاول کے دانے  
اک اک کر کے کیا جھٹ پٹ  
مینے چڑیا نے

پتے میں لپٹا  
سرد ہو اکا جھونکا بھی  
گلتا ہے تیکھا

گرمی کا احساس  
اور زیادہ ہوتا ہے  
دیکھ کے ٹھنڈی گھاس

آیا سال نیا  
چڑیا چمکے او ہو ہو  
امبر آباہا



شبِ نغم کے قطرے  
ڈول رہے ہیں سبزے پہ  
ہولے ہولے سے

برفانی موسم  
سمٹیں اور کہاں تک اب  
اپنے گھر میں ہم

طوفانی جھکڑ  
روک نہ پائے جنگل میں  
مینڈک کی ٹرٹر

ٹھہیر گیا دریا  
سورج ڈوبا شام آئی  
دھندلایا سبزہ

سمت نما گاڑی  
ڈھونڈ رہی ہے کہرے میں  
وحشی آبادی

پیاری الہڑسی  
دُور کہیں ویرانوں میں  
مسکائے چیری

دانہ ڈالیں آپ  
لڑنا دیکھیں بطنوں کا  
یہ بھی ہے اک پاپ

مینڈک کا نغمہ  
پہلے نغمہ لگتا ہے  
آخر میں نوحہ

آپس میں یکجا  
مینڈک ایسے بیٹھے ہیں  
جیسے اک کنبہ

کیسا جاڑا ہے  
کاغذ جیسا سیلا تھا  
اب تک سیلا ہے

## طبع زاد

کس نے دیکھا ہے  
وقت بتانا جانے کیوں  
اچھا لگتا ہے

چلتا رہتا ہوں  
اپنے من کی اگنی میں  
جلتا رہتا ہوں

پاسِ مراتب ہے  
رُخ تو ورنہ کعبے کا  
میری جانب ہے

ممتا کا دم تھا  
یا بچے کی ایڑی میں  
آبِ زم زم تھا

رستہ چلنا ہے  
لمحوں کے اس جنگل میں  
دن تو ڈھلنا ہے

بے موسم ایسے  
آتے جاتے یہ بادل  
لگتے ہیں کیسے؟

دریا بہتا ہے  
کوئی ایسے موسم میں  
گھر میں رہتا ہے

دشمن پودوں کی  
بادِ صرصر محسن ہے  
سُکھے پتوں کی

کچھ بھی یاد نہیں  
سارے قصے دل کے تھے  
دل ہی شاد نہیں

منہ چکائے دھوپ  
آگے پیچھے گوری کے  
پھول بھریں بہروپ

گوری تیرا روپ  
سایا ناچے آنگن میں  
دیواروں پہ دھوپ

ایسے میں اے کاش  
کوئی میرے ہونٹوں پر  
رکھ دے سیب کی قاش



بے سُر اور بے تال  
اک دُوبے کی چوکھٹ پر  
موسم کھیلیں حال

کون مرا ہم راز  
بے جس ان دیواروں کے  
کون اٹھائے ناز

شہر میں قحطِ آب  
اُس پر سورج دکھلائے  
اپنی آب و تاب

خالی بادل ہے  
اکثر آتارہتا ہے  
دھرتی پاگل ہے

ہوتا ہے اکثر  
چیونٹی کو بھی بارش میں  
لگ جاتے ہیں پر

مکڑی کا جالا  
دیواروں کے زخموں پر  
روئی کا گالا

بچے پا کھنڈی  
آتے جاتے رہتے ہیں  
دیکھے پگڈنڈی

باغوں میں تتلی  
بچوں پر کر دیتی ہے  
کوئی عملِ سفلی

موسم جاڑے کا  
اک دن ہو تو لے آؤں  
کمبل بھاڑے کا

کیا جنگل کیا گھر  
سارے موسم اک جیسے  
مٹی کے اندر

بالوں میں جوڑا  
کنگن بولے ہاتھوں میں  
آنکھوں میں کجرا

سورج کی کرنیں  
اُونچے نیچے ٹیلوں پر  
چلتی رہتی ہیں

بارش میں بلبل  
باندھ رہی ہے کس کے لیے  
آوازوں کا پل

کشتی رانی میں  
وحشت کرنے لگتے ہیں  
سائے پانی میں

پتے پت جھڑ میں  
جنگل شور مچاتا ہے  
آندھی جھکڑ میں

رہ کر خود پیاسا  
دریا پیاس بجھائے اور  
ہم روکیں رستہ

گھر میں گل دستہ  
دیکھ رہا ہے کھڑکی سے  
بارش کا رستہ

پانی بادل پر  
دھرتی دوڑے بے چاری  
گھٹنوں کے بل پر

تنہا اک کو نپل  
ویرانے کو لکارے  
دکھلائے گس بل

صبح بخ بستہ  
سورج شاید کھرے میں  
بھول گیا رستہ



بادل کا سایا  
مانگ رہا ہے دھرتی سے  
خوشبو کا تحفہ

پیچھے فردا کا  
آگے آگے سایا ہے  
عمر رفتہ ہے

پودوں کے چہرے  
پیلے کیوں پڑ جاتے ہیں  
پت جھڑ سے پہلے

برفانی موسم  
آتش دان میں لایا ہے  
یادوں کا البم

بارش کا پانی  
بھنگڑا ڈالے کھیتوں میں  
سوئے دہقانی

ہاتھوں میں پتھر  
مستقبل کا بوجھ الگ  
بچوں کے سر پر

کیسی برقی رو  
اپنے اندر رکھتے ہیں  
گلبائے خود رو

چھوٹے چھوٹے گھر  
چھوٹی چھوٹی آسائیں  
چھوٹے چھوٹے در

بارش کے اندر  
ننھی ننھی بوندوں کے  
بہتے جائیں گھر

پیچھے کچے گھر  
آگے چو نے پتھر کے  
اُونچے اُونچے در

آنکھوں کی اندھی  
راہ کھائے لوگوں کو  
پاگل پگڈنڈی

اس دھرتی سے کیا؟  
کر سکتا ہے سرتابی  
دھرتی کا جایا

میں نے دیکھا کل  
پانی کے اک چشمے پر  
بیٹھا تھا جنگل

راوی کہتا ہے  
دریا کی تہہ میں کوئی  
سایا رہتا ہے

صورت پت جھڑکی  
نک نک دیکھے پانی میں  
دھقانی لڑکی

دریا بستی سے  
قطرہ قطرہ لے جائے  
چابک دستی سے

کیسے سنے ہیں  
جن آنکھوں میں رہتے ہیں  
ان کو ڈستے ہیں

گھر کی چھتری پر  
زرد کبوتر شام ڈھلے  
آتا ہے اکثر

جیون ساگر میں  
روشن روشن اک چہرہ  
میں پس منظر میں

عظمت کے آگے  
دریا پانی بھرتے ہیں  
پر بت کے آگے



جینا دریا سے  
میں نے مرنا سیکھا ہے  
اپنے آبا سے

تنہائی کے دن  
کائیں کائیں یادوں کی  
لمحوں کی بھن بھن

کیا کرتے ہم بھی  
خشک ہوا گر لے جاتی  
آنکھوں کا نم بھی

منزل پہ آ کے  
بھید کھلا ہم بھاگے تھے  
سائے کے پیچھے

پہلے ہم بھاگے  
پھر دیکھا تو اک دنیا  
ہم سے تھی آگے

فرقت کا مارا  
شور مچائے گلیوں میں  
آوارہ پتا

ہوتا ہے سا جن  
لہجے میں بھی موسم کا  
اپنا تیکھا پن

اُجبک شہزادی  
ڈھونڈ رہی ہے کانٹوں میں  
پھولوں کی وادی

گھر گھر میں جا پان  
لیکن میرے دل میں ہے  
میرا پاکستان

بوڑھا چرواہا  
اُونگھ رہا ہے چھایا میں  
بھیڑیں آوارہ

مٹی مٹی ہے  
رنگت چاہے جیسی ہو  
خوشبو اپنی ہے

بے سُر بے سرگم  
ناچ رہی ہے آنگن میں  
بارش چھم چھم چھم

ٹیلکم پاؤڈر سا  
مل جاتی ہے بچوں کے  
منہ پر خشک ہوا

زندہ گھونگھے بھی  
تخ بستہ ہو جاتے ہیں  
اپنے اندر ہی

بیماری کے بعد  
جب شیو کیا تو چہرہ بھی  
نکلانا ہموار

شاید آج کے بعد  
اب نہ ایسی بارش آئے  
اور نہ ایسی شام

پت جھڑ کی تقدیر  
ننگے ننگے پیڑوں کی  
اک عریاں تصویر

لمحوں کی شمشیر  
کاٹ رہی ہے صدیوں سے  
صدیوں کی زنجیر

آنگن سونا ہے  
بلبل جانے کب چبکے  
کاغذ کورا ہے

بیٹے اسی سال  
کب سے بے حس آئینہ  
دیکھ رہا ہے حال



پتھر اور انسان  
دونوں شاید بھول گئے  
منصب اور استھان

سورج دے سمان  
رنگ بکھیرے دھرتی پر  
بچے کی مسکان



سنتے ہیں اس گلی میں  
اک شخص منحنی سا  
کچھ رنگ گندی سا  
ہونٹوں پہ مسکراہٹ  
آنکھوں میں کچھ نمی سی  
باتوں میں زندگی سی  
کچھ دن سے آبا ہے

تم جس کو ڈھونڈتے ہو  
یہ شخص وہ نہیں ہے  
وہ شخص اب کہاں ہے؟



سنے ہیں اس گلی میں  
اک شخص منحنی سا  
کچھ رنگ گندی سا  
ہونٹوں پہ مسکراہٹ  
آنکھوں میں کچھ نمی سی  
باتوں میں زندگی سی  
کچھ دن سے آ بسا ہے

تم جس کو ڈھونڈتے ہو  
یہ شخص وہ نہیں ہے  
وہ شخص اب کہاں ہے؟



کلن دل کی رہاں کھلا  
میں دل کر یہ کہاں کھلا  
سرف ماخ کی حیا ہو قبا کھلے ملک  
پھر تو وہ جان حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

رہتا ہر دم بجھا بجھا سا کچھ  
ہو گیا دل کا مشغلہ سا کچھ

گرمی اس کے ہاتھوں کی  
چشمہ شیشے پانی کا

وہ جو اک خواب ہم نے دیکھا تھا  
خواب ہی عمر بھر رہے گا